گلِ آثارِ رحمت

نام تاریخ: 1980 / 1400 ہجری

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

ناشر

محمد عمر کیرانوی

گلِ آثارِ رحمتؒ

(ڈاکٹر) تنویر علوی

۱۴۰۰ھ

1980ء

رحمت اللہ بابِ رحمتِ حق
ورقے از کتابِ رحمتِ حق
ہم چوں ضَوَ بر سپہر کردہ طلوع
از کرانہ چوں مہر کردہ طلوع
چوں اشاراتِ غیب را دانی!
از نوامیسِ فطرتش خوانی!
معنیٔ کہنہ از کتاب نہ خواست
بر رُخِ آئینہ نقاب نہ خواست
زیست را وجہِ اعتبارے داد
ہم چوں کرمکِ بجاں شرارے داد
چوں مہِ نو بہ مجلسِ احباب
ہم چوں شمعے بہ سایۂ محراب
لوحِ دل راچو نقش پردازے
بقلم دادہ پردہ سازے

نقشِ پایش نشانِ منزل شد
دودِ منزل چراغِ محفل شد

اِکتسابش بہ انتخاب شد است
بہ دل و دیدہ فتح باب شداست
حرفِ او اجتہاد را ماند
اجتہادش جہاد را ماند
نکتۂ کز حدیث و قرآن ست
بر لبش صد دلیل و برہان ست
ناز دارد بسوزِ سینۂ او
معنی روشن از سفینۂ او
ہمچو عشق از نگاہ پردہ ورے
چوں گُلِ آفتاب دیدہ ورے
کاسۂ فقر، ہمچو ماہ، بدست
سالکاں را چراغِ راہ بدست
بہ خسِ آشیاں حضر کردہ
ہم بدوشِ صبا سفر کردہ

عنصرِ عشق کو بگِل دارد
شعلہ در خاک مشتعل دارد

چوں ز افرنگ نقشہا دیدہ
دست از برگ عافیت چیدہ
چوں رم برق در خرام آمد
چوں دم تیغ بے نیام آمد!
سخن از راہ اختلاف بگفت
حرفِ حق بود واشگاف بگفت

چہ عجب دانشے و تدبیرے
سبحہ در دستِ شاں چوں زنجیرے
دیں شدہ پیرو سیاست او
صدق چوں بندۂ ریاست او
موج در موج چوں سراب بہ رقص
ذرہ ہا پیش آفتاب بہ رقص
بر کفِ خستہ دام افشانند
دانہ چینند و دام افشانند

بے ضمیراں صلیب را چہ کنند
مردہ گاناں طبیب را چہ کنند

مدّعی صد طلسم باطل بست
ژالہ ہا پیش آفتاب شکست
از حقایق چوں پردہ ہا برداشت
کلمہ حق بہ لوحِ دل بنگاشت
ایں نہ قندیل دستِ رہبانی است
ہمچو فانوس پیکر افشانی است
ہمچو مانی نوشتہ ہا دارند!
ہم بہ تثلیث رشتہ ہا دارند!
جعل ہا در صحف بنا کردند!
بہر کتمانِ حق چہا کردند!
نقشِ حق را سواد داغ کجا؟
شعلہ را اندراں سراغ کجا؟

وحی و الہام از فسانہ دراں
کذب و تاویل را بہانہ دراں

چوں سرِ منزلِ یقیں دارند
ایں چہ بت ہا در آستیں دارند

نسخہء کیمیا کہ وا کردہ
مکتبِ فکر را بنا کردہ
آنکہ نذرانہ ز صولت بود
قسمتے از نصیب دولت بود
بدل خستہ انجمن آراست
مژہ از اشکِ خوں چمن آراست
بہ حکیماں نشانِ نور شد است
بہ کلیماں چراغِ طور شد است
بہرِ دنیا نہ ساخت قبلہ گہے
از دل و دیں شناخت قبلہ گہے
شاخِ دولت بہ آشیانہ نخواست
تکیہ گاہے "ز آستانہ" نہ خواست
سجدہ را جست چوں دیارِ حبیب
کردہ، ہم خاکِ دل، نثارِ حبیب

یافت کلمے بہ سایۂ حرمین
بردہ نامے بہ "پایۂ حرمین"

جناب مولٰنا امداد صابری صدر استقبالیہ کمیٹی، حضرت العلامہ مولٰنا رحمت اللہ کیرانوی یادگار کمیٹی کا

خطبۂ استقبالیہ

ان بزرگان دین اور اکابرین ملت حضرت العلامہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی محبت و شفقت بھری طبیعت اور ان کے حسن اخلاق کا یہ اثر ہوتا تھا کہ انسان پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ اور انتہائی عقیدتمند ہو جاتا تھا۔

چنانچہ میرے والد ماجد حضرت مولانا شرف الحق صاحب صدیقی، قادری و صابری حضرت العلامہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے علمی، دینی کارناموں سے پہلے ہی واقف تھے۔ ۱۸۸۵ء میں آپ حجاز مقدس حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے مولانا کیرانوی کی خدمت میں حاضری دی جب تک مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ حرم شریف کی حاضری کے بعد تمام وقت انہی بزرگوں کی بابرکت خدمت میں گذارتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اس سفرنامہ میں ان ملاقاتوں کا ذکر فرمایا ہے۔

"میں حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب کے یہاں حضرت العلامہ مولانا رحمت اللہ صاحب کے حضور میں حاضر ہونے کا مشتاق خط لئے بیٹھا تھا تو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا ان کو مولانا رحمت اللہ صاحب کے پاس لے جاؤ۔ ان کے ہمراہ مولانا صاحب کے مدرسہ میں پہنچا مولانا صاحب ایک چھوٹے سے تہہ خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے خط پڑھوایا مولٰینا صاحب بہت مہربانی و شفقت سے پیش آئے اور خط سن کر فرمایا کہ تم اپنا اسباب یہاں لے آؤ میں نے عرض کیا کہ میرے ہمراہی اور لوگ بھی ہیں۔ غرض کھانا اس روز مولانا ہی کے ہمراہ کھایا اور باتیں کرتا رہا۔"

مکہ معظمہ میں میں جبتک رہا حاجی (امداد اللہ) صاحب اور مولانا (رحمت اللہ) صاحب کے حضور میں حاضر رہنا اور کسی سے تعلق واسطہ تھا۔ اکثر حاجی صاحب اور مولانا صاحب کے یہاں اسقدر بیٹھنا ہوتا تھا کہ وہیں کھانا کھانا پڑتا تھا اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے تو گھر میں میرے کھانے کے واسطے کہلا بھی بھیج رکھا تھا۔ دو وقت آتا تھا۔ میں بعض وقت نہ ہوتا تو محمد ہاشم اور اپنے پوتے برخوردار منشی مولوی محمد سعید صاحب کو تاکید کر رکھی تھی۔ چونکہ حاجی صاحب یعنی محمد عابد صاحب نے خط میں سند کے واسطے مولانا صاحب کے پاس لکھا تھا اس لئے یہ فکر تھی

رسند لے لوں ۔ حافظ عبداللہ مدرس اور دیگر مدرسین مدرسہ یعنی مولانا عبدالسبحان صاحب اور حضرت
۔ سب کے یہ رائے ہوئی کہ اظہار الحق کو سنادو، میں نے تحریک بھی کی ۔ سب کو شوق ہوگیا ۔ اور ہندوستان
ی بھی حالت بیان کی کہ یہ اس کی مدد کا وقت ہے چونکہ میں عازم بیت المقدس و مدینہ منورہ دونوں کا تھا اس وجہ
سے مولانا سلمہ اللہ تعالیٰ نے یہ رائے دی کہ اس وقت دونوں عزموں کو ملتوی رکھیئے ۔ اظہار الحق کے ختم ہونے کے
بعد عمدہ طور سے تم کو مدینہ منورہ بھجوادوں گا اور وہیں سے بیت المقدس بھی چلے جانا ۔ یہ بات میرے سمجھ میں آگئی
اور میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ بہت اچھا ایسا ہی ہوگا ۔ میں حافظ عبداللہ صاحب کے ہمراہ منا اور مزولفہ و
عرفات وغیرہ میں رہا ۔ حج ان کے ہمراہ کیا ۔ انہوں نے مجھے اپنے لوگوں کے ہمراہ نہ رہنے دیا اور اپنے ساتھ رکھا ۔
میری شغدف میں مولانا صاحب کے پوتے منشی محمد سعید اور حاجی احسان اللہ صاحب دہلوی تھے منا مزولفہ اور
عرفات میں ہم سب ایک ہی جگہ ٹھیرے" (۴۵۰)

مولانا صاحب کے یہاں کثیر حاجیوں اور بہت سے لوگوں کی امانتیں وہاں بھی معرفت عبداللہ صاحب مدرس
کے رکھی گئی تھیں ۔ مولانا صاحب بصارت زائل ہونے کی وجہ سے ہر کام سے معذور ہیں ۔ بعض کتب ردِ نصاریٰ
بھی ہندوستان سے مولانا تک پہنچتی تھیں دو کتابیں مولانا محمد علی کانپوری نے بھی بھیجی تھیں ۔ مولانا سلمہ اللہ تعالیٰ
کتب و اخبارات سُننے کے بہت شائق ہیں ۔ مجھسے ان کتب کے بعضے مقامات سنے تھے ۔ اس وقت آپ نے
ازالۃ الاوہام شروع کر رکھی تھی ۔ وہ بھی تہ خانہ میں ہوا کرتی تھی ۔ محمد ہاشم اور مولانا صاحب کے پوتے (منشی
محمد سعید) کا سبق ہوا کرتا تھا ۔ دن کا کھانا مولانا صاحب کے پاس، اور رات کو مکان میں ۔ حضرت مولانا صاحب
نے ایک نسخہ اظہار الحق عربی اور فرانسیسی مجھے عنایت فرمایا تھا ۔ مولانا صاحب اُسوقت بھی کتب ردِ نصاریٰ
لکھنے کے مشتاق ہیں ۔ اگر اُن کی بصارت پھر آجائے تو وہ اب بھی ایک جامع کتاب تصنیف فرمادیں ۔"

"مجھسے پہلے حضرت مولانا صاحب کے یہاں شاید دو مرتبہ امتحان طلباء ہوتا تھا ۔ جس کی وجہ سے مدرسہ
میں بڑا مجمع ہوتا تھا ایک مجمع میں یہ کاتب الحروف بھی تھا ۔ لڑکے مصری لہجے میں قرآن شریف بہت خوب پڑھتے تھے ۔
اکثر لوگ طلباء کو انعام بھی دیا کرتے تھے ایک بدو کا لڑکا جو جدول گاؤں میں رہتا تھا ۔ اس کی بہت ہی عمدہ آواز تھی جب
وہ پڑھتا تھا لوگوں پر رقت طاری ہوجاتی تھی ۔ میں بھی اسے مکان پر لے گیا تھا ۔ ہمارے رفقاء نے روپے بھی دیئے تھے ۔"

"طواف زیارت کے لئے دسویں کے روز حرم شریف ضرور جانا پڑا ۔ میں، ہاشم، احسان اللہ، منشی محمد سعید وغیرہ گدھوں
پر سوار ہو کر گئے ۔ طواف کیا، زمزم پیا ۔ نماز پڑھی اُس کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے حضور گئے ۔ بعد میں
مکان پر حاضر ہوئے ۔ مولانا نے مکان میں بلایا ۔ اس روز مولانا صاحب کی صاحبزادی کو دیکھا، حضرت حاجی امداد اللہ
صاحب نے نذر گذرانی بندہ بھی شریک تھا ۔ اس روز اُسوقت کا کھانا ہم نے وہاں کھایا تھا ۔" (۴۵۷)

"اظہار الحق حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے شروع کرا رکھی تھی ۔ آپ اکثر مقام مباحثہ آگرہ خوب بسط سے
کرتے تھے ۔ اور اپنے جوابات محل وقوعہ پر بتاتے تھے ۔ تخمینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھ سات سبق میری شرکت میں

"میرے پاس عالم و فاضل، ماہر و کامل مولوی شرف الحق صاحب قاری جلال الدین کے فرزند تشریف لائے مجھ سے اجازت طلب کی۔ حالانکہ میں اس لائق نہیں کہ مجھ سے اجازت کا سوال کیا جائے۔ نیز یہ کہ وہ علماء و مشاہیر وقت کی اجازت سے پہلے سے صاحبان علم و فضل ہیں اور موجزن سمندر ہیں۔ اور عالم ظاہر و باطن کے جامع ہیں اور جن کی شہرت نیک نامی کے ساتھ ہر ملک میں ضرب المثل ہے۔ یعنی حضرت فقیہ و محدث قاری مولوی عبدالرحمٰن اور حضرت فقیہ و محدث مولوی رشید احمد مگر چونکہ ان کو میرے ساتھ حسن ظن ہے تو میں نے ان کی درخواست قبول کر لی اور ان کی خواہش کو پورا کیا۔ اس امید پر کہ ان علماء کے سلسلہ میں میں بھی منسلک ہو جاؤں۔

"سو میں کہتا ہوں کہ رحمت اللہ ابن خلیل الرحمٰن کہ میں نے ہر اس چیز کی روایت کی اجازت دی۔ جس روایت کی مجھ کو اجازت حاصل ہے۔ جو کچھ میں نے اپنے شیوخ سے (اللہ تعالیٰ ان کو اجر عطا فرمائے) روایتاً یا درایتاً حاصل کیا۔ ان شروط پر جو علماء حدیث کے نزدیک معتبر ہیں نیز چونکہ مولوی صاحب کو دیکھا کہ وہ نصاریٰ کے قریب سے واقف و آگاہ ہیں اور اس کے اسرار سے آشنا ہیں۔ اس لئے میں نے ان کو اجازت دی کہ وہ اس کے متعلق تہذیب و شائستگی کو مدنظر رکھتے ہوئے وعظ کرتے رہیں اور نصرانیت کی تردید فرماتے رہیں اور یہ کہ مجھے اپنی نیک دعاؤں میں خواہ جلوت یا خلوت میں ہوں نہ بھولیں اور اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے رہیں کہ میرا بھی اور ان کا بھی نیک اعمال پر خاتمہ ہو۔ اور امیدوں میں کامیاب کرے۔

رحمت اللہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ

۱۸۸۵ء کے بعد آپ دوبارہ حج کرنے کے لئے ۱۹ سال کے بعد ۱۹۰۴ء میں تشریف لے گئے جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی فوت ہو چکے تھے۔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے مہتمم اسوقت حضرت مولانا محمد سعید صاحب تھے مکہ معظمہ پہنچے تو مدرسہ صولتیہ میں بھی گئے۔ وہیں اپنا اسباب رکھا اور جتنے دن مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ مدرسہ صولتیہ میں بھی رہائش اختیار کی اور چھ مرتبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے مزارت پر حاضری دی چنانچہ آپ نے ان باتوں کا ذکر اپنے دوسرے سفرنامہ میں کیا ہے۔

"مجھے مولانا عبدالحق صاحب اور مولانا محمد سعید صاحب سے ملنا ضروری تھا۔ پیرانی (اہلیہ حضرت حاجی امداد اللہ) صاحبہ کے حضور میں جانا ضرور تھا۔ حضرت العلامہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے مدرسہ میں اسباب رکھا۔ چھ مرتبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکی کے مزارات پر حاضر ہوا۔" ان دونوں حضرات کے مزارات مقدسہ قریب قریب ہیں اور ایک ہی احاطہ میں ہیں۔

میرے والد حضرت مولانا شرف الحق صاحب روزنامچہ لکھتے تھے اور روزنامچوں کے آخری صفحوں پر ان خطوط کا جو وہ لوگوں کو روانہ کرتے تھے ان کے پتے اور تاریخ تحریر کرتے تھے۔ ان روزنامچوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرے والد حضرت مولانا شرف الحق صاحب کے حضرت مولانا محمد سعید صاحب سے

تھے ۔ ظہر کے بعد اظہار الحق حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے یہاں ہوا کرتی تھی " چنانچہ آپ لکھتے ہیں
حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے حضور میں حاضر ہوا ۔ مدرسہ کے مدرسین سے ملا ۔ تہ خانہ
میں حضرت مولانا لیٹے ہوئے تھے ۔ میں نے پیر پکڑے اُٹھ کھڑے ہوئے
اور بیت المقدس کا حال پوچھنے لگے ۔ یہ باتیں بڑی دیر تک ہوتی رہیں ۔ میاں منشی محمد سعید مولانا کے پوتے
بھی موجود تھے اور کمترین کو اس وقت سخت ہی ضعف تھا اور بات اچھی طرح نہ ہوتی تھی ۔ مولانا صاحب تمام سفر
بیت المقدس کی کیفیت اور راستہ کا حال، کیفیت اور اسلام کی حالت اور بیت المقدس کی آبادی وغیرہم
پوچھتے رہے اور کاتب الحروف عرض کرتا رہا کھانا اسوقت کا وہیں کھایا ۔"

" حضرت مولانا نے جاتے وقت فرمایا تھا کہ شرف الحق صاحب کا اسباب یہیں منگوا لینا ۔ اسی وقت یا شام
کو میاں محمد سعید صاحب نے مجھے حضرت مولانا صاحب کے اس حکم سے مطلع فرمایا ۔ یہ لڑکا نام ہی کا سعید نہیں ہے
بلکہ افعال میں بھی سعید ہے اپنے ماں باپ کا ایک ہی لڑکا ہے ۔ مدرسہ مشنری انبالہ میں پڑھتا تھا ۔ مولانا صاحب
کے سگے بھائی کا بیٹا ہے ۔ مولانا صاحب نے ان کو شرک و کفر کی تعلیم سے بچانے کے لئے ہی ہند سے حجاز میں بلالیا
ہے محنتی اور نیک بخت بھی ہے خدا اس کی عمر میں برکت عطا فرمائے ۔ میں نے اس کی تعمیل میں کوشش کی اور اپنا
اسباب شام کو لیکر رباط میں حاضر ہوا ۔ مولانا کی چارپائی کے پاس اپنا بستر بچھایا حضرت نے چارپائی کے واسطے اصرار کیا ۔
میں نے اسے سوئے ادبی سمجھ کر قبول نہیں کیا ۔ ۔ ۔ مولانا سے صبح و شام اکثر مات کو علمی گفتگو رہتی تھی یعنی ان کے کلام
سے مستفید ہوتا تھا ۔ اکثر مناظرہ اکبرآباد کا ذکر ہوا کرتا تھا ۔ اور مسلمانوں کی دردناک اور افسوس سے بھری ہوئی حالت
پر تبصرہ ہوتا تھا ۔ اور ان کی بہبودی اور بہتری کی باتیں ہوتی تھیں ۔ مجھ پر ایک خاص عنایت تھی خدا ان کو خوش
اور زندہ سلامت رکھے ۔ میں اس عرصہ میں علاج بھی کرتا رہا ۔ مجھے قبض وغیرہ کی شکایت زیادہ تھی ۔ حضرت مولانا
صاحب کے داماد مولانا اسماعیل صاحب، صاحب دل اور صاحب حکمت تھے ان کو نبض دکھائی اور حافظ عبداللہ صاحب
میرے سفارشی بنے اکثر جناب حاجی امداد اللہ صاحب اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے حضور میں دن گذرتا
تھا کمزوری کی وجہ سے اتنی قوت نہ تھی کہ ان دونوں مکانوں اور مدرسہ کے سوا اور کہیں جا سکوں ۔ ابھی تک مجھ
میں اتنی نقاہت باقی تھی کہ سوائے کھچڑی کے اور کچھ کھا نہیں سکتا تھا ۔ میرا کھانا پکانا میاں جمال الدین طالب علم و خادم
مولانا صاحب کے تھا اور انتظام ذمہ میاں محمد سعید کے تھا ۔"

" حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قبلہ سے جب دلائل الخیرات، حزب البحر و حزب الاعظم کی اجازت کے واسطے عرض
کیا ۔ حکم ہوا مولوی عبدالحق صاحب کو سنا دو سند دیدوں گا ۔ میں نے وہاں دلائل الخیرات وغیرہ کتب صحاح ستہ "
وغیرہ سنا کر سند لی ۔ سید حسین صاحب ابن حبشی سے بھی اولیات سنا کر سند حاصل کی یہ سابق مفتی مکہ معظمہ تھے ۔
حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو بھی اولیات سنا کر سند لی ۔ لیکن حضرت مولانا نے جمیع علوم اور تردید نصاریٰ
سب کی سند عطا فرمائی ۔ یہ حضرت کا حسن ظن ہے ۔" (۵۱۰)

مسلسل خط وکتابت ہوتی تھی ۔ کوئی مہینہ یا ہفتہ ایسا نہیں گذرتا تھا کہ مولانا سر
صاحب کو خط تحریر نہ فرماتے ہوں ۔ اور اس کا جواب حضرت مولانا محمد سعید صاحب نہ
چنانچہ والد ماجد حضرت مولانا شرف الحق صاحب امریکہ تبلیغ اسلام کے لئے تشریف
واپس آگئے اس کی اطلاع حضرت مولانا محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کو ملی تو ا
مولانا شرف الحق صاحب کو ایک خط مبارکباد کا تحریر فرمایا ۔

میرے والد ماجد حضرت العلّامہ مولانا شرف الحق کا انتقال جنوری ۱۹۳۶ء کو ہوا ۔ اسی اثناء میں حضرت مولانا سعید صاحب بھی فوت ہوئے ۔ ان کے انتقال کے بعد مدرسہ صولتیہ مہتمم ان کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد سلیم صاحب مقرر ہوئے ۔

حضرت قبلہ والد ماجد حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکّی کے اسقدر معترف و مداح تھے کہ دن میں نہ معلوم کتنی مرتبہ ان حضرات کا ذکر فرماتے تھے ۔ ان کے مناظروں اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے کارناموں اور ان کے روحانی واقعات سناتے رہتے تھے ۔ چنانچہ ان حضرات کا اثر ہمارے گھر کے ماحول پر ہی نہیں بلکہ رہائشی مکان پر بھی پڑا ۔ والد ماجد اور والدہ ماجدہ نے اکثر ان حضرات کو اسی مکان میں خواب میں تشریف لاتے ہوئے دیکھا ان کی تشریف آوری کا یہ اثر ہے کہ یہ مکان لب سڑک ہے اس کے نیچے کے حصہ اور بالاخانہ کے دروازے چوپٹ کھلے رہتے ہیں ۔ لیکن خدا کا فضل ہے کہ ہمارے اس گھر میں کبھی کسی چیز کی آج تک چوری نہیں ہوئی ۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے والد ماجد سے انہی بزرگوں کے مجاہدانہ اور علمی کارنامے اور معرکوں کے حالات سُنے یا اس کے بعد حضرت مولانا حسرت موہانی ، مولانا محمد علی جوہر اور امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں الہلال اخبار کے مضامین پڑھے ۔ ان کے اور نیتاجی سُبھاش چندر بوس کی صحبت میں رہا ۔ چنانچہ ان کے خیالات دل دماغ پر چھاگئے ۔ انہی کے اثرات ہیں کہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں الحمد اللہ ابتک میرے عزائم میں کوئی جُنبش نہیں آئی اور حق وصداقت کی آواز بلند کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی ۔

میں نے ۱۹۳۹ء سے "فرنگیوں کا جال" تالیف کرنی شروع کی ۔ یہ کتاب عیسائیوں کے ہندوستان میں پرتگیزی دور میں آنے ، مغلیہ دور میں پاؤں جمانے اور عیسائی مشینریوں کے تبلیغی کاموں کو شروع کرنے اور ان کا مقابلہ علماء کرام نے ہر نہج سے فرمایا اس کی ایک جامع و مبسوط تاریخ ہے ۔

اس کتاب میں حضرت العلامہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے حالاتِ زندگی اور انہوں نے جو عیسائی مشینریوں کے خلاف کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ درج نہوں ۔ کیسے ممکن ہو سکتا تھا ۔ چنانچہ اس کے لئے میں نے حضرت مولانا محمد سلیم صاحب اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد شمیم صاحب کو خطوط لکھے ۔ اس طرح والد صاحب کے اس خاندان سے جو تعلقات تھے اس کا سلسلہ جاری ہوا ۔ اس کتاب کے لئے حضرت مولانا رحمت اللہ

ندگی کے علاوہ جس بات کی بھی معلومات حاصل کی ۔ اس کو انہوں نے فراہم کیا ۔ چنانچہ فرنگیوں کا
مات انہی پر دو حضرات کی فراہم کردہ ہے ۔
میں نے اور میری اہلیہ صابرہ خاتون نے سب سے پہلا حج ۱۹۵۳ء میں کیا ۔ اُس سال بھی ہم دو
مدرسہ صولتیہ میں مقیم ہوئے ۔ اس سال ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۹ء تک دس بار حجاز مقدس میں حاضری ہو چکی ۔
یہ سب برکات وسعادت حضرت العلامہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی اور حضرت حاجی امداد اللہ صا
مہاجر مکی کی روحانی فیوض کے طفیل وبدولت حاصل ہوئی ۔ اور ان دونوں باپ حضرت مولانا محمد سلیم صاحب
اور بیٹے جناب مولانا محمد شمیم صاحب کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہے ۔ اگر ان حجوں میں حضرت مولانا محمد سلیم صا
اور جناب مولانا محمد شمیم صاحب کی عنایتوں، کرم فرمائیوں اور احسانات کو تحریر میں لایا جائے تو ایک کتا
تالیف ہوسکتی ہے ۔ میرے ان حج کے دس سفر ناموں میں انہی کی کرم فرمائیوں کا زیادہ ذکر ہے ۔
تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے صرف دو واقعوں سے اندازہ لگا لیجئے ۔ کہ ہم پر حضرت مولانا رحمت
صاحب، مولانا محمد سلیم صاحب اور جناب محمد شمیم صاحب کی نظر کرم اور احسانات کیا کیا ہیں ۔
جب میں حج بیت اللہ کے لئے جاتا ہوں تو اس وقت میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میں حج سے پہلے
اور دوسرے حج کے بعد مدینہ منورہ میں جاؤں اور حضور کے روضہ اطہر پر دو مرتبہ حاضری دوں درود وسلام پڑھ
چنانچہ اس دستور کے مطابق میں ۱۹۶۶ء میں خانہ کعبہ میں حاضری دینے کے بعد مدینہ منورہ پہنچا ۔ حضرت
العلامہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی سوانح عمری "آثار رحمت" کے نام سے تالیف کی مسجد نبوی میں بیٹھ کر نظر ثا
کرنے کے بعد ۲۹ رشوال ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۹۶۶ء کو بعد نماز ظہر "آثار رحمت" کا مسودہ لیکر
رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روضہ اطہر کی جالیوں کے سامنے پہنچا وہاں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی
کہ جس سال یہ کتاب "آثار رحمت" طبع ہو جائے اسی سال میں اس کو لے کر حضور کے سامنے حاضر ہوں ۔
یہ دعا مانگ کے کچھ دنوں کے بعد میں اپنی اہلیہ کو لیکر مکہ معظمہ پہنچ گیا ۔
حج سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ مدینہ منورہ جانے کا قصد کیا ۔ تو جناب رئیس احمد صاحب مالک
کشمیر چپل اسٹور بلیماران دہلی ہمارے ہمراہ مدینہ منورہ پہنچے ایک دن رئیس احمد صاحب بعد نماز عصر ریاض الجنۃ
کی روضہ اطہر کی جالیوں کے پاس بیٹھے ہوئے قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ ان پر غنودگی طاری ہو گئی ۔
اس غنودگی میں دیکھتے ہیں کہ امداد صابری روضہ اطہر سے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل رہا ہے ۔ اور ایک ہاتھ نے
اس کی طرف اشارہ کیا کہ یہ امداد صابری گھوڑا سوار جا رہا ہے ۔
میں حج سے فارغ ہو کر دہلی پہنچ گیا ۔ ۱۹۶۷ء میں آثار رحمت طبع ہو گئی ۔ حج کے جانے کا قاعدہ یہ ہے
کہ جو حاجی ایک مرتبہ حج کے لئے جاتا ہے اس کو دوسری مرتبہ اسوقت اجازت ملتی ہے جب اس کو پانچ
سال گذر جائیں ۔ یہ پابندی مجھ پر بھی عائد ہوتی تھی ۔ لیکن خدا کا کرم اور مہربانی دیکھئے امداد دعا کی قبولیت کے

اثرات ملاحظہ کیجئے حضرت العلامہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی پایۂ حرمین کی روحانی برکات کا نتیجہ یہ نکہ
پہلی بار میٹرو پولیٹن کونسل کی ممبری کے الیکشن میں کامیاب ہوا۔ دہلی حج کمیٹی کا ممبر نامزد ہوا۔ اور ز عبادت بریلوی
نے مجھ کو ویلفیئر آفیسر بنا کر حج بیت اللہ کے لئے روانہ کیا۔

اس دعا کا ثمرہ اور "آثارِ رحمت" کی مقبولیت کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ہر دو سال اور ایک سال کے بعد حج
بیت اللہ کے لئے جانے لگا۔ اور تین سال سے برابر جارہا ہوں۔

۱۹۷ء کی بات ہے کہ میں مدینہ منورہ سے اپنے وطن جانے کے لئے جدّہ روانہ ہوا۔ جدّہ پہنچا تو
ایک روز روانگی میں باقی تھا چنانچہ ہم میاں بیوی عمرہ کے لئے مکہ معظمہ پہنچے۔ خانہ کعبہ اور حضور کے روضۂ اطہر
کے سامنے یہ التجا کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ حجاز مقدس کی روانگی سے پہلے مجھ کو ایسی علامت دکھا دے کہ آئندہ سال
پھر ہم حج کے لئے حاضر ہوں۔

میں اور میری اہلیہ خانہ کعبہ سے واپسی پر عمرہ سے فارغ ہو کر مدرسہ صولتیہ کے دفتر پہنچے حضرت مولانا
محمد سلیم صاحب دفتر میں تشریف فرما تھے۔ میں اسی خیال میں فکرمند بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر مولانا محمد سلیم صاحب
نے فرمایا فکر مت کرو اس سال ہم تم کو حج کے لئے بلائیں گے۔ یہ بات سن کر میں نے اللہ جلِ شانہٗ کا شکریہ ادا کیا۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد سلیم صاحب نے اپنے وعدہ کے مطابق اپنے پوتوں کی معرفت سعودی عرب کے
ریال کے ڈرافٹ اور ہوائی جہاز کے دو ٹکٹ روانہ فرمائے۔ ان دونوں چیزوں کے بعد جانے میں کوئی رکاوٹ
نہیں ہوئی۔ چنانچہ ہم دونوں میاں بیوی بڑے آرام و سکون کے ساتھ حجاز مقدس پہنچے اس کے بعد دو سال تک
سعودی ریال کے ڈرافٹ آتے رہے اور ہم حجاز مقدس پہنچتے رہے اور قیام بھی مدرسہ صولتیہ کے ایک حجرہ میں کیا۔

ان واقعات کے بیان کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ حضرت العلامہ مجاہد اعظم مولانا رحمت اللہؒ کیرانوی پایۂ حرمین
کے خاندان سے ہمارے خاندان کے بہت دیرینہ تعلقات ہیں۔ اور میرے والد ماجد اور میں اس خاندان کے
احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔

پچھلے سال ۹ ستمبر ۱۹۷۹ء کو میں نے اور میرے ساتھیوں تنویر علوی صاحب، نثار فاروقی صاحب، خلیق انجم
صاحب اور مصطفیٰ راہی صاحب وغیرہ نے والد ماجد حضرت مولانا شرف الحق صاحب کی بھی صد سالہ تقریب منائی
تھی اِسوقت مجھ کو خیال آیا تھا کہ اپنے بزرگان ملت کی بھی یادگار منانی چاہئیے۔ اس خیال پر عمل اپنی مصروفیت
کی وجہ سے نہ کر سکا اور یہ خیال ذہن سے نکل گیا۔

۲ دسمبر ۱۹۷۹ء کو حجاز مقدس سے بمبئی پہنچا۔ تو جناب مولانا حامد الانصاری غازی صاحب سے دورانِ گفتگو یہ
خیال عود کر آیا۔ کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی، مولانا قاسم نانوتوی حضرت
مولانا فضل حق خیرآبادی، حضرت امام بخش صہبائی دہلوی اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری وغیرہ کی یادگار منائی
جائے۔ غازی صاحب نے اس بات سے اتفاق کیا۔

دہلی ۱۲ دسمبر کو پہنچا۔ جناب تنویر علوی صاحب، نثار فاروقی صاحب، جناب خلیق انجم صاحب، ذہین نقوی صاحب اور جناب مصطفیٰ راہی صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد دہلی کے اہل علم حضرات سے مشورہ کرنے کے لئے ۱۲ دسمبر ۱۹۷۹ء کی میٹنگ کا حسب ذیل دعوت نامہ روانہ کیا۔

محترمی آداب و نیاز

"حضرت العلامہ مجاہد اعظم مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی جنھوں نے عیسائی مشینریوں کی قوت اور سازشوں کو پامال کیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شرکت فرمائی۔ اس کے بعد مکہ معظمہ میں ہجرت فرماکر مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔"

"اسی طرح شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی جو شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی تحریک آزادی کے آخری امام تھے انہوں نے بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شرکت فرمائی۔ جنگ کی ناکامی کے بعد حجاز مقدس میں ہجرت فرمائی اور وہاں سے انگریزی سامراجیت کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے۔"

"یہ دونوں حضرات ہندوستان کے مائیہ ناز علما و مشائخ اور مجاہدین میں سے تھے جن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔"

"ان دونوں حضرات کی یاد آئندہ سال منانے کے لئے ۱۲ دسمبر ۱۹۷۹ء کو چار بجے میرے غریب خانہ چوڑی والان میں ایک مشاورتی میٹنگ رکھی ہے تاکہ آئندہ کا پروگرام بنایا جائے۔ امید ہے کہ وقت مقررہ پر تشریف لاکر ممنوع فرمائیں گے۔"

امداد صابری

چنانچہ اس میٹنگ میں طے ہوا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کی یادگار ۶ اپریل ۱۹۸۰ء کو بچوں کے گھر دریا گنج دہلی میں اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی یادگار ۳۱ اگست ۱۹۸۰ء کو منائی جائے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی یادگار کمیٹی کی حسب ذیل عہدیدار و ممبران کی استقبالیہ کمیٹی تشکیل کی گئی۔

سرپرست۔ الحاج حکیم عبدالحمید صاحب، ہمدرد دواخانہ دہلی۔ جناب راجندر کمار گپتا، میئر دہلی

استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین امداد صابری۔ نائب چیئرمین۔ جناب نثار فاروقی صاحب، مولانا اخلاق حسین قاسمی

جنرل سیکریٹری جناب تنویر علوی صاحب، جناب مصطفےٰ راہی صاحب۔ سیکریٹری ذہین نقوی صاحب۔

ممبران۔ جناب مولانا سعید احمد اکبرآبادی، جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، جناب مولانا افتخار حسین کاندھلوی عبدالباقی صاحب مدراس، محمد مسلم صاحب ایڈیٹر اخبار دعوت دہلی۔ مولانا حامد الانصاری غازی، سنت نرائن [illegible] گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، خواجہ حسن ثانی وغیرہ وغیرہ

ہندو پاکستان کے علماء و مشائخ ادیب و صحافی حضرات کو مدعو کرنے کے لئے ایک ابتدائی دعوت نامہ [illegible]

جوان حضرات کو روانہ کیا گیا۔ سب سے پہلے اس یادگار جلسہ میں شرکت کی حسب ذیل منظوری حضرت عبادت بریلوی پرنسپل اورنٹیل کالج یونیورسٹی لاہور نے عنایت فرمائی۔

مولانا سلام مسنون: — آپ کا گرامی نامہ ملا۔ میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ ملاقاتیں رہیں گی۔ دلی کی زیارت بھی ہو جائے گی۔ مولانا کیرانوی کے جلسے میں شریک ہونے کی سعادت بھی حاصل ہو جائیگی میرے ساتھ سید سجاد رضوی صاحب بھی ہوں گے ان کو بھی دعوت نامہ بھجوا دوں گا۔"

۲۷ جنوری ۱۹۸۰ء عبادت خیر طلب

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کو بھی دعوت نامے ارسال کئے گئے۔ حضرت مولانا ازہر شاہ کشمیری نے اس میں بے حد دلچسپی لی۔ اپنا اور اپنے صاحبزادہ کا مضمون سوونیر کے لئے روانہ کیا۔ اور دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ سے ملاقات کر کے ان کو اس یادگار و تاریخی اجلاس میں شرکت کے لئے آمادہ و تیار کیا۔ حضرت العلامہ قاری محمد طیب صاحب کو بھی یاد دہانی کراتے رہے۔

کیرانہ میں ایک روز کے لئے گیا۔ منشی رشید علوی صاحب اور توصیف علوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کیرانہ کے عمائدین کے نام و پتے لکھوائے۔ توصیف صاحب نے اپنا ایک قیمتی مضمون اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی منقبت میں ایک نظم بھی ارسال کی اور مشورے بھی دیتے رہے۔

بمبئی بھی جانا ہوا۔ جناب سلمان قاسمی اور جناب مولانا حامد الانصاری غازی صاحب نے دلچسپی لی۔ اپنا قیمتی وقت اس کام میں صرف کیا اور بمبئی کے معززین علماء مشائخ اور صحافی حضرات کی میٹنگ کی سلیمان صاحب نے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے حالات زندگی بمبئی کے اخبارات میں چھپوائے۔ مولانا غازی صاحب نے اپنا ایک مضمون سوونیر کے لئے عطا کیا۔"

میں نے جناب مولانا محمد شمیم صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ انہوں نے بے حد معروفیت کے باوجود اس میں شامل ہونے کا وعدہ فرمالیا ہے۔ ان کا ممنون ہوں۔

حضرت رئیس امروہوی کو بھی دعوت نامہ ارسال کیا گیا۔ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے وہ شریک نہ ہو سکیں گے۔ لیکن انہوں نے اپنی ایک منقبتی نظم سوونیر کے لئے روانہ فرمائی ہے۔ یہ تحفہ بیش بہا ہے۔ جس کا اجلاس شکر گذار ہے۔

جناب محترمی عبدالباقی صاحب نے مدراس میں کافی دلچسپی لی۔ اور سعی بھی کی مالی اعانت بھی فرمائی اور مدرسہ باقیات صالحات کے اساتذہ کو اس اجلاس میں شمولیت کے لئے دعوت دی۔

بہت سے علماء، مشائخ، اور صحافی حضرات نے شرکت کے وعدے تحریر فرمائے ہیں۔ اس پر آشوب زمانہ میں انسان اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ وعدہ کرنے کے باوجود حالات سے مجبور ہو جاتا ہے اور حالات ایسے ہو جاتے ہیں

جو وعدہ ایفا نہیں کر سکتا۔

بہر حال جن حضرات نے وعدے فرمائے ہیں۔ اور جنہوں نے شرکت بھی فرمائی ہے اور جو شریک نہ ہونے سے مجبور رہے ہیں ان سب کا میں اور استقبالیہ کمیٹی کے عہدیداران وارکان ممنون اور شکر گزار ہیں۔ انہی حضرات کی سعی سے یہ یادگار وتاریخی اجلاس کامیاب ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اور جن حضرات نے سامعین کی حیثیت سے شرکت کی ہے اجر دے گا۔ اور اپنی نعمتوں اور عنایتوں سے نوازے گا۔

امداد صابری

۱۴۔ مارچ ۱۹۸۰ء

حضرت مولٰنا سید محمد ازہر شاہ قیصر دیوبند

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کی مجاہدانہ زندگی

ہندوستان نے بڑے بڑے اکابر علماء صلحا اور دانشوران امت کو پیدا کیا، جن کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، اور جن کی علمی، دینی، اصلاحی اور تبلیغی خدمات تاریخ ہند کے زرّیں ابواب ہیں، رہتی دنیا تک ان کی عظیم الشان خدمات یاد رکھی جائیں گی، اور آنے والی نسل بجا طور پر ان پر فخر کرے گی۔

انہی نمایاں علماء اُمّت میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا شمار ہے، آپ ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے، نو برس کی عمر میں اردو، فارسی کا نصاب ختم کر لیا اور عربی تعلیم کے لئے ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی کا سفر کیا، وہاں مدرسہ حیات میں داخل ہو کر آپ نے عربی تعلیم شروع کی، تکمیل تعلیم حضرت شاہ عبد الغنی مجددی (م ۱۲۹۶ھ) سے کی، ان سے کتب حدیث کا درس لیا، معقولات کی تکمیل کے سلسلہ میں لکھنؤ حضرت مولانا مفتی سعد اللہ مراد آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے معقولات کی اونچی کتابیں پڑھیں۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۲۵۶ھ میں شادی ہوئی، اور پھر ملازمت کرنی پڑی، مگر علم وفن سے جو طبعی مناسبت تھی وہ سامنے آئی، اور کتب بینی اور مطالعہ پر لگ گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان پر غلبہ ہو چکا تھا، گو برائے نام مغلیہ سلطنت کا چراغ بھی ٹمٹما رہا تھا اور بہادر شاہ لال قلعہ میں تخت شاہی پر جلوہ افروز تھے، اور انگریز اپنی چالاکی سے ہندوستان پر چھا جانے کی تدبیروں میں منہمک تھے یورپ کے پادریوں کا ایک جم غفیر ہندوستان کی زمین پر اتر آیا تھا، اور وہ اسلام کے خلاف زبان طعن کھول چکے تھے، اور موقع پا کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور تعلیمات اسلام کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔

حالات نے ہندوستانی علماء کو جھنجھوڑا، اور یہ عیسائی پادریوں کے مقابلہ پر آنے کے لئے مجبور ہوئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا ابوالمنصور اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی جیسے علماء، میدان میں اترنے پر مجبور ہوئے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اسی زمانہ میں ایک کتاب ازالۃ الاوہام کے نام سے لکھی جس میں پادریوں کے اعتراضات کا مدلل جواب تھا، کتاب ۵۶۴ صفحات میں پھیلی ہوئی تھی، رمضان ۱۲۶۹ھ میں آپ نے اسے چھپوا دیا۔ پادری فنڈر جس کی پادریوں میں بڑی شہرت و مقبولیت تھی، اس نے میزان الحق

نام کی کتاب لکھ کر اسلامی تعلیمات پر زبان درازی کی تھی، ازالۃ الاوہام میں اس کا دندان شکن جواب لکھا گیا۔

پادریوں کی ہزار سعی کے باوجود اس کتاب کا جواب نہیں ہوسکا، قطب العالم حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے اپنی ایک تصنیف میں ازالۃ الاوہام کے متعلق لکھا ہے۔

"باوجودیکہ اس کو چھپے ہوئے سینتیس برس ہوگئے، مگر کسی (پادری) نے ایک مبحث کا بھی پورے طور پر جواب نہیں دیا۔" (پیغام محمدی)

اس کتاب سے مولانا رحمت اللہ کرانوی کی علمی حلقوں میں بڑی شہرت ہوئی، اور علماء کو اندازہ ہوا کہ پادریوں سے مناظرہ میں یہ بڑے کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر وزیر خاں نے پہلی ملاقات میں ہی عرض کیا کہ آگرہ میں مناظرہ ہونے والا ہے، وہاں ضرور آئیں،

آگرہ کے دو مناظرے بڑی شہرت رکھتے ہیں، دونوں ۱۸۵۴ء میں ہوئے، پہلا مناظرہ پادری کے گھر پر ہوا عوام کو اس کی خبر بعد میں ہوئی، مگر پادریوں کو اندازہ ہوگیا کہ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ عیسائی مذہب کی بدوہات پر کیسے قادر ہیں اور ساتھ ہی یہ کس قدر ذہین ہیں۔

۱۰، ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء کا تاریخی مناظرہ بڑے ردوکد کے بعد طے ہوا، پادری صاحبان بھاگنا چاہتے تھے، اس مناظرہ کے نام عیسائی مشینریوں میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا، پادریوں نے خوب تیاریاں کیں، چنانچہ تاریخ مقرر پر مناظرہ شروع ہوا، جس میں بہت سارے پادری صاحبان اور علماء کرام نے شرکت کی، مناظرہ میں مولانا رحمت اللہ کرانویؒ کے جوہر خوب کھلے، اور پادریوں کو لاجواب ہونا پڑتا تھا، پھر خود پادری صاحب نے پہلے دن کا مناظرہ یہ کہکر ختم کیا کہ اب کل ہوگا،

دوسرے دن شہرت کی وجہ سے بڑا مجمع ہوا، اور پادریوں کو منہ کی کھانی پڑی، مسلمانوں میں جو پادریوں کی طرف سے ایک دھاک سی بیٹھ گئی تھی، وہ ختم ہوگئی اور ایسا معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں جان آگئی خود مولانا رحمت اللہؒ نے لکھا ہے۔

"مباحثہ کا فائدہ یہ ہوا کہ پادریوں کا بالکل وہ زور شور گھٹ گیا اور کتابیں جو کثرت سے بانٹتے تھے اس کثرت سے موقوف کردیں، اور مسلمانوں سے الزام اٹھ گیا اور عیسائیوں کا وہ تکبر اور اعتقاد فاسد مٹ گیا۔"

اس کے بعد بھی پادری فنڈر برابر مولانا رحمت اللہ کرانوی سے خط وکتابت کرتا رہا، اور اپنا علمی رسوخ جتاتا رہا، مگر اس کی ہوا خیزی ہوچکی تھی، گھمنڈ ٹوٹ چکا تھا، اور پہلی بات باقی نہیں رہ گئی تھی،

۱۸۵۷ء میں آزادی کی جنگ چھڑ گئی، انگریزی اقتدار کے خلاف فوج اور ملکی باشندوں نے حملہ شروع کردیا، اور سعی کی کہ انگریزوں کے قدم یہاں جم نہ سکیں، ہندوستان ان کے دباؤ سے آزاد ہوجائے، اور ان کی بڑھتی ہوئی قوت وشوکت پامال ہوجائے، علماء کرام کی ایک بڑی جماعت نے کھل کر انگریزی اقتدار کے خلاف جنگ میں حصہ لیا، ان علماء میں حضرت مولانا رحمت اللہ کرانوی بھی شریک تھے، دہلی برابر آجا رہے تھے، اور لوگوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔

لیکن قدرت کا یہ کرشمہ سامنے آیا کہ ملکی باشندوں کو شکست ہوئی اور انگریزی فوج نے کامیابی حاصل کی، بہادر شاہ
ظفر گرفتار کر کے رنگون لے جائے گئے، ان کے صاحبزادوں کا انگریزوں نے سر قلم کرا دیا، اور شاہی خاندان بُری طرح
تباہ و برباد ہوا، پھر دہلی پر انگریزوں نے پوری دلی کو ہندو مسلم لاشوں سے پاٹ دیا، ہزاروں گھر ویران ہو گئے، لاکھوں
انسان گولیوں کے نشانے بن گئے، کئی دنوں تک دہلی میں قتل عام ہوتا رہا، بلاتمیز سر قلم ہونے لگے، بالخصوص علماء
اسلام پر قیامت ٹوٹ پڑی، انگریزی حکومت نے ان تمام علماء کے نام وارنٹ جاری کئے، جو اس جنگ آزادی میں
پیش پیش تھے، ان میں قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، امام ربانی حضرت
مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور دوسرے نمایاں علماء سر فہرست تھے، انگریزوں کے
گھروں میں شادیانے بج رہے تھے اور مسلمانوں کے گھروں میں کوئی ماتم کرنے والا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ عجیب بے کسی
اور کس مپرسی کا عالم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان کا باقی رہ جانا محال سا ہے۔
ان حالات میں سوچنا پڑا کہ کیا کیا جائے، کن علماء کا ہندوستان میں رہنا ضروری ہے
اور کن علماء کا یہاں سے بچ کر ہجرت کرنا مناسب ہے، چنانچہ ان حضرات نے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی
اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح کا ہندوستان میں ہی رہنا ازبس ضروری ہے، البتہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب
کے متعلق طے پایا کہ آپ کا ہجرت کر جانا ہی بہتر ہے، کیونکہ آپ امیر المومنین کی حیثیت رکھتے تھے، اور انگریزوں کی
کڑی نگاہ تھی۔ اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رح کے متعلق بھی یہی طے پایا کہ اس وقت ان کو بھی ہندوستان
چھوڑ دینا چاہئے، چنانچہ یہ دونوں حضرات ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ پہونچے اور بڑی صعوبتوں اور اذیتوں سے
دو چار ہو کر پہونچے، اُس زمانہ میں سواریوں کی یہ سہولت حاصل نہیں تھی جو آجکل ہے، پہلے حضرت حاجی صاحب تشریف
لے گئے، پھر مولانا رحمت اللہ صاحب نے رخت سفر باندھا۔
ان حضرات نے مکہ مکرمہ میں قیام کیا۔ ابتدا میں بڑے امتحان سے گذرے، اجنبی کی حیثیت سے دوسرے ملک
میں پہونچے تھے، فاقہ کرنا پڑا۔ اور ذہنی الجھنیں پیش آئیں مگر چونکہ اللہ والے تھے، اللہ کے گھر پہونچ کر خوش و خرم تھے۔
ابتدا میں مولانا رحمت اللہ صاحب کا قیام حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے پاس رباط داؤدیہ میں رہا۔ یہ زمانہ
سلطان عبد العزیز خان کی خلافت کا تھا اور اس وقت امیر مکہ شریف عبد الرب عون محمد تھے،
ابتدا میں طواف کے سوا کوئی خاص کام نہیں تھا، چونکہ مزاج علمی اور تصنیفی تھا اس لئے جی بہلانے کے لئے حرم محترم میں جہاں
علماء کرام درس دیا کرتے تھے، وہاں جا کر بیٹھا کرتے تھے، اور اس سے طبیعت کو سکون ملتا تھا، اُس زمانہ میں سب سے زیادہ
مشہور درس شیخ العلماء سیّد احمد صاحب شافعی کا تھا، عام طور پر ان کے ہی درس بیٹھنے کا معمول تھا، ایک دن سیّد صاحب رح نے
اپنے درس میں کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے امام شافعی کے مسلک کی ترجیح دلائل سے بیان فرمائی، اور اس ضمن میں احناف کی دلیل
کے خلاف بولے، اور اس کی کمزوری کی طرف اشارا کیا،
حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رح ہندوستانی ذہین و ذکی عالم دین تھے اور حنفی المذہب تھے ساتھ ہی جیّد الاستعداد تھے،

مطالعہ وسیع تھا، اس دن درس میں ہی ارادہ کرلیا کہ اس مسئلہ پر استاذ محترم شیخ العلماء سے گفتگو کرنی ہے۔ اثنائے درس میں
کچھ نہ بولے اور یہ مناسب بھی نہیں تھا، مگر جب درس ختم ہوگیا، تو تنہائی میں حاضر خدمت ہوئے، اور مسئلہ مذکورہ کے
سلسلہ میں بات چھیڑی، اور مولانا رحمت اللہ صاحب نے احناف کے دلائل بیان کئے، استاذ محترم سنتے رہے،
اور کہیں بولتے بھی رہے۔

شیخ العلماء سید احمد دحلان کو اندازہ ہوگیا، یہ ذی استعداد عالم حنفی ہیں چنانچہ علمی بحث ختم ہونے کے بعد
دریافت فرمایا کہ آپ کا وطن کہاں ہے، کہاں قیام ہے اور کیا مشغلہ ہے، اور یہ بھی پوچھا کہ یہاں کیسے آنا ہوا،

مولانا رحمت اللہ صاحب نے تفصیل سے اپنے حالات بیان فرمائے اور بتایا کہ ہندوستان سے حرم محترم
آنے کی وجہ کیا پیش آئی، اور اس وقت ہندوستان کے حالات کیا ہیں۔

دوسرے دن شیخ العلماء سید احمد دحلان نے حضرت حاجی امداد اللہ اور مولانا رحمت اللہ صاحب دونوں بزرگوں
کی اپنے دولت کدہ پر دعوت کی، وہاں اور تفصیل سے گفتگو ہوئی، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے مولانا رحمت اللہ صاحب
سے فرمایا کہ آپ حرم میں درس دینا شروع کردیں جس سے مولانا کا علمی حلقہ میں تعارف ہوگیا، اور آپ کے علم وعمل کا چرچا شروع ہوگیا۔

ادھر اتفاق یہ ہوا کہ وہی پادری فنڈر جس سے آپ کا آگرہ میں مناظرہ ہوا تھا وہ ۱۸۵۷ء کے بعد قسطنطنیہ
پہونچا، کیونکہ اس زمانہ میں انگلستان سے سلطان عبدالعزیز کے تعلقات خوشگوار تھے، یہاں وہ پادری دربار سلطانی
میں حاضر ہوا، اور ہندوستان کے مناظرہ کا تذکرہ کیا اور اپنی برتری ظاہر کی، اور یہ بھی بتایا کہ اب ہندوستان میں
بہت سارے مسلمان عیسائی ہورہے ہیں۔

اس گفتگو سے سلطان کو تشویش ہوئی کہ اگر ایسا ہے تو بہت فکر کی بات ہے، چنانچہ شریف مکہ کو لکھا کہ حج کے
زمانہ میں بہت سارے ہندوستانی علماء حج کے لئے آتے ہیں، ان آنے والوں سے تحقیق کرو کہ ہندوستان کے
مسلمانوں کا کیا حال ہے اور کیا واقعی وہاں علماء اسلام فنڈر کا جواب نہ دے سکے اور اس کی وجہ سے وہاں کے
مسلمان عیسائی مذہب قبول کررہے ہیں۔

امیر مکہ نے شیخ العلماء سید احمد دحلان سے ذکر کیا کہ خلیفۃ المسلمین کا ایسا فرمان آیا ہے، انہوں نے بتایا کہ
جس عالم دین سے فنڈر کا مناظرہ ہوا تھا وہ خود یہاں موجود ہیں، چنانچہ دوسرے دن شیخ العلماء مولانا رحمت اللہ
کو ساتھ لے کر شریف مکہ کے پاس پہونچے، وہاں امیر مکہ سے تفصیلی گفتگو ہوئی، اور بتایا کہ یہ پادری کی غلط بیانی
ہے اور جھوٹا پروپگنڈا ہے وہ مناظرہ میں شکست کھا چکا تھا، اور بحمداللہ ہندوستان میں بڑے بڑے علماء
موجود ہیں اور پادریوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کررہے ہیں۔

امیر مکہ نے سلطان عبدالعزیز کو صورت حال لکھی، اور لکھا کہ اگر حکم ہو تو خود ان عالم صاحب کو آپ کی
خدمت میں بھیجدوں، سلطان مشتاق تھا، مولانا رحمت اللہ بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ ترکی کے سلطان کی
خدمت میں حاضر ہوئے، یہ ۱۸۶۴ء کی بات ہے۔ سلطان نے آپ کی اپنے ملک کے تمام قابل ذکر علماء سے ملاقات کرائی۔

اور آپ سے ہندوستان کی تفصیل سنی جس سے سلطان کو اطمینان ہوا۔ مولانا ساتھ اپنی تصانیف بھی لے گئے ہونگے وہاں کے علماء نے ان کتابوں کو دیکھا بھی ہوگا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کو سلطان عبدالعزیز نے خلعتِ فاخرہ اور تمغۂ مجیدی سے سرفراز کیا۔ اور گراں وظیفہ منظور کیا۔

سلطان عبدالعزیز نے اس ملاقات کے بعد عیسائی مشنریوں کے فتنہ کو روکنے کے لئے قدم اٹھایا اور قسطنطنیہ میں مشنریوں کی سرگرمی پر پابندی عاید کردی۔ وہاں مشنریوں کو فکر ہوئی۔ مگر سلطانی حکم تھا، وہ حکم یہ تھا۔

"ترکی گورنمنٹ اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ اسلام پر کسی طرح کا حملہ ہو سربازار یا نجی طور پر کیا جائے۔ وہ مشنریوں کو یا ان کے کارندوں کو اسلام کے خلاف منادی کرنے کی اجازت نہیں دیتی اور اس طرح ہر کوشش ترکی گورنمنٹ کی نظر میں قومی مذہب پر حملہ تصور کیا جائیگا۔ وہ کسی مباحثہ کی کتاب کو بر سربازار یا نجی طور پر تقسیم کرنے یا فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

(آثارِ رحمت، بحوالہ صلیب کے علمبردار ص ۱۲)

مولانا رحمت اللہ کی قسطنطنیہ میں پہنچنے کی خبر پاتے ہی پادری فنڈر قسطنطنیہ سے جا چکا تھا۔ اس کو مقابلہ کی جرات نہ ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان کی دھاندلی یہاں چلنے والی نہیں ہے۔ بے عزتی کا منہ دیکھنا ہوگا۔ مولانا کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

اظہار الحق نامی کتاب آپ نے سلطان عبدالعزیز کے ایماء پر ہی لکھی اور چھ ماہ میں مکمل کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کی۔ جس سے سلطان بہت خوش ہوئے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان کو اسلامی تعلیمات اور اس کی اشاعت سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ مذہب اسلام کا گرویدہ تھا اور اس کے خلاف کسی کام کو پسند نہیں کرتا تھا اور اس کے یہاں علمائے اسلام کی قدر و منزلت تھی اور جہاں بھی دینی کام ہوتا۔ اس کی عزت افزائی اپنا فرض سمجھتا تھا اللہ تعالیٰ اس کے درجات بلند فرمائے۔

ترکی کے علماء نے بھی مولانا رحمت اللہ کی بڑی قدر افزائی کی۔ مہمان خانہ میں عام طور پر علمائے ترکی آکر آپ سے ملتے اور مسائلِ علمیہ پر آپ سے گفتگو کرتے اور پھر آپ کی لیاقت کی تعریف کرتے تھے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے عیسائی مذہب کے خلاف اور اسلام کی حمایت میں بڑی محنت کی۔ انجیل میں تحریف ثابت کی۔ پادریوں کی زبان پر تالا لگایا۔ ان کی زبان درازی آپ کی وجہ سے بند ہوئی۔

آپ نے مندرجہ ذیل قیمتی اور علمی کتابیں لکھ کر چھپوائیں۔

(۱) ازالۃ الاوہام (۲) ازالۃ الشکوک (۳) اعجاز عیسوی (۴) احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث (۵) بروق لامعہ (۶) البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف (۷) معدل اعوجاج المیزان

(۸) تقلیب المطاعن (۹) معیار التحقیق (۱۰) اظہار الحق (۱۱) آداب المریدین ۔

ان کتابوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوسکے گا۔ کہ مولانا رحمت اللہ کے علم و فن میں مہارت کا کیا حال تھا
بالخصوص مولانا مذہبِ عیسائی کے کیسے جاننے والے تھے ۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے دوسرا اہم کام مکہ مکرمہ میں یہ کیا کہ اس زمانہ میں وہاں کوئی ڈھنگ
کا مدرسہ نہیں تھا۔ جس سے کتاب و سنت کی اشاعت کماحقہ ہوسکتی۔ مولانا نے مہاجر ہونے کے باوجود وہاں ایک
دینی مدرسہ صولتیہ واغ بیل ڈالی ، اور اُسے ترقی دی ۔

مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ مولانا کا ہی قائم کردہ ہے۔ آپ نے اس مدرسہ کی بنیاد یکم رمضان المبارک
سنہ ۱۲۹۰ھ کو رکھی ، کرایہ کے مکان میں یہ چلتا رہا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں کلکتہ کی صولت النساء بیگم اور انکے
داماد شاہ نوازش حسین حج کے لئے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے اور انھوں نے مدرسہ کا حال سُنکر دو ہزار دو سو اکہتر
ریال دئے جس سے ابتدا ر تعمیرات کی ہوئی اور مدرسہ کے لئے مکان تیار ہوا۔

مولانا مرحوم کو اس مدرسہ سے بڑی محبت تھی اور اس کی ترقی اور تعلیم پر آپنے بہت زیادہ توجہ دی۔
ہندوستان میں بھی اپنے جاننے والوں کو خطوط لکھے ۔ مکہ مکرمہ کے مقامی لوگوں نے بھی اس مدرسہ کی ترقی
میں حصہ لیا۔ اخیر حکومت ترکی نے بھی کچھ رقم متعین کردی تھی۔ جو ملا کرتی تھی۔ اس کی تفصیل مولانا کی سوانح حیات
آثار رحمت، میں دیکھی جاسکتی ہے۔

الحمد للہ مدرسہ صولتیہ ابتک قائم ہے۔ اور برابر ترقی کررہا ہے ۔ ہزاروں مسلمان بچوں نے وہاں تعلیم
پائی اور برابر پا رہے ہیں۔ اس دینی درسگاہ سے بہت سارے لوگوں نے فیض پایا۔ اللہ تعالیٰ اُسے برابر قائم رکھے۔

آپ نے قسطنطنیہ کا دو مرتبہ اور سفر کیا اور ہر مرتبہ سلطان ترکی نے آپکا اعزاز کیا بلکہ سلطان کے طلب پر
ہی تشریف لے گئے۔ آخیر میں آنکھ کے آپریشن کے لئے ترکی بلائے گئے ۔ مگر مولانا آپریشن پر وہاں راضی نہ ہوئے۔
وہاں سے واپس آکر مکہ مکرمہ موتیا بند کا آپریشن کرایا وہ کامیاب نہ ہوا۔ روشنی جاتی تھی [illegible] ۱۳۰۵ھ سے
روشنی سے محروم ہوگئے۔ اس کا صحت پر بہت گہرا اثر پڑا۔ آخر ۲۲ ررمضان المبارک ۱۳۰۸ھ میں بلد الحرام
میں ہی انتقال فرمایا اور مالکِ حقیقی سے جاملے اور جنت المعلیٰ میں سپرد خاک ہوئے ۔

نذرِ عقیدت

بخدمت حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی

جناب رئیسؔ امروہوی صاحب

عالم و فاضل و زاہد و متقی!
حضرتِ رحمتہ اللہ کیرانوی

وہ مجاہد مفسّر، وہ مردِ خدا! — وہ مبلغ وہ شیدائے دینِ نبیؐ!
روحِ اسلام کا حق نما ترجماں — خم ہوا جو نہ باطل کے آگے کبھی
اہلِ ایماں ہیں شاہد کہ اسکی حیات — خدمتِ دینِ حق میں بسر ہوگئی
رحمت اللہ نام اور رحمت تھا وہ — واہ مرحوم کی بے بدل زندگی!
یاد اس کی ہے فرض آج اس قوم پر — اس فریضے سے غافل نہ ہونا کبھی

قوم پر سایہ افگن ہے اب بھی رئیسؔ
رحمتِ، رحمت اللہ کیرانوی!

⁂

کیرانہ اور کاشانۂ رحمت

(حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کا وطن مالوف اور انکی رہائش گاہ)

از:- توصیف علوی بی۔اے (ہیڈ ماسٹر، مکتب اسلامیہ کیرانہ)

پایۂ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کی ذات گرامی ایک ایسی ہمہ گیر صفات کی حامل تھی جس سے زندگی کے مختلف شعبے کسی نہ کسی اعتبار سے مستفید ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا بیک وقت عالم بھی تھے اور مجاہد بھی اہل قلم بھی تھے، اور اہل سیف بھی۔ اگر انھوں نے ایک طرف برسہا برس تک مسند درس وتدریس کو زینت بخشی اور اہل طلب کو قال اللہ وقال الرسول کا درس دیا تو دوسری طرف تصنیف وتالیف کے دائرہ میں اپنے معرکتہ الآرا علمی آثار سے غیر معمولی اضافہ کیا۔

مولانا کا وطن مالوف اور مکان مسکونہ آپکی تاریخ ساز علمی جدوجہد اور مجاہدانہ کارناموں کی زندہ یادگاریں ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کا مکان نہ صرف اہل کیرانہ بلکہ حضرت کے تمام عقیدت مندوں اور اصحاب علم وحکمت کیلئے کاشانۂ رحمت ہے۔

کیرانہ ضلع مظفر نگر مغربی یو۔پی کے قدیم تاریخی قصبات میں سے ہے۔ پرتھوی راج چوہان کے زمانہ میں بعض نیم تاریخی روایتوں کے مطابق کیرانہ اور اس کے قرب وجوار کا علاقہ (جو اضلاع سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ اور کرنال کی حدود سے تعلق رکھتا ہے) راجہ کرن پال دت رانا اور اس کے عزیزوں کے مابین چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ راجہ کے نام کرن پال دت رانا ہی کی مناسبت سے اُسے کیرانہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ راجہ کرن پال دت رانا کے زمانہ کی اب کوئی یادگار باقی نہیں۔ لیکن اب سے کچھ سال پہلے تک قصبہ کی جانب جنوب ایک اونچا ٹیلہ موجود تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہیں راجہ کرن کا قلعہ تھا۔

اس قصبہ میں داخل ہونے والے سب سے پہلے مسلمان ان اہل جہاد کے ساتھ آئے۔ جن کے سربراہ امام سیّد محمود شہید سبزواری تھے۔ جن کا مزار جھنجھانہ ضلع مظفر نگر میں ہے اور یہ جگہ "امام صاحب" کہلاتی ہے۔ امام صاحب

ں کے ساتھیوں میں وہ بزرگ بھی تھے جن کا مزار کیرانہ میں ہے اور اُسے بھی امام کہتے ہیں۔

بعد ازاں سادات، علوی و انصاری آئے۔ سادات علویہ کے مورثِ اعلیٰ حضرت شیخ ابو سعید رازی تھے۔ جن کی اولاد محلہ خیل خورد (منقری خیل) میں آباد ہے۔ انصاریوں کی آبادی محلہ انصاریان میں ہے۔

اسی محلہ میں وہ قدیم سروری گنبد عمارت بھی ہے۔ جسے اس قصبہ میں مسلمانوں کی آمد کے ابتدائی دور کی یادگار کہا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے یہ محلہ سروریان" کہلاتا ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہوتی ہے کہ اس محلہ کا قدیم نام محلہ انصاریان" ہے۔ اس لئے کہ اس سے متصل ایک چھوٹا سا محلہ "زیرِ انصاریان" کہلاتا ہے۔

اس قصبہ میں مسلمان آبادیوں کی قدامت کا اندازہ یہاں کی بہت سی تاریخی مسجدوں اور قدیم قبرستانوں سے ہوتا ہے یہاں کے بعض قبرستان چھ سات سو برس پرانے ہیں۔ ان میں چاندنی خطیرہ کا قبرستان بھی ہے۔ جس کی بہت سی قبریں دودھی کے پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور جن کا تعمیری اسلوب بہت پرانا ہے۔ بعض قبروں سے وہ اینٹیں برآمد ہوئی ہیں۔ جو اَب سے سات سو، آٹھ سو برس پیشتر ہندو راجاؤں کے زمانہ کی تعمیروں میں استعمال ہوتی تھیں۔

یہاں کے کہنہ و شکستہ آثار میں دودھی کے پتھر سے بنے ہوئے وہ کنوئیں بھی ہیں۔ جن سے صدیوں تک کھیتوں اور آبادیوں کے لئے آب رسانی کا کام لیا گیا ہے۔ محلہ افغانان کے قریب ایک مسجد پٹھانوں کے دور کی یادگار ہے۔ اس میں جو کتبہ لگا ہوا ہے۔ وہ شیر شاہ کے بیٹے اسلام خاں کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں کی جامع مسجد کا اندرونی کتبہ عہد اکبری میں ابتداءً اس کی تعمیر کی نشان دہی کرتا ہے۔

محلہ قدم رسول، محلہ خیل، محلہ سرائے کی مسجدیں عہدِ اورنگزیب اور شاہ عالم اول کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس قصبہ کی دیرینہ روزی کے نشانات اور اس کے تاریخی آثار میں وہ عمارات خاص طور پر اہم ہیں۔ جو نواب مقرب خاں کے زمانہ میں تعمیر ہوئیں۔

نواب مقرب خاں شیخ حسن بینا طبیب شاہی کے بیٹے اور عہد جہانگیری کے بہت ممتاز امراء میں سے تھے۔ اور مولانا رحمت اللہ کے اجدادی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کیرانہ انکی جاگیر کا مرکزِ ریاست تھا۔ یہاں اُن کے زمانہ میں ایک بہت بڑا باغ تھا۔ جسے سولکھا باغ کہتے تھے۔ اس میں نواب مقرب خاں نے ہر طرح کے گرم سیری اور سرد سیری درخت لگائے تھے۔ اس کی آبیاری (کہا جاتا ہے) کہ مختلف مقامات پر بنائے گئے تین سو کنوؤں سے ہوتی تھی۔ جہانگیر خود بہ نفسِ نفیس ایک بار اس باغ میں سیر کے لئے آیا تھا۔ جس کا ذکر اس نے اپنی تزک میں کیا ہے۔

اس باغ کے درختوں میں سے تو اب تک کوئی نشان کیا موجود ہوتا۔ مگر اس سے متعلق تعمیرات کے بہت سے کھنڈرات اور نشانات موجود ہیں۔ جنہیں کیرانہ کی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق کہا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک دو پختہ تالاب ہے۔ جسے اب نواب کا تالاب کہتے ہیں۔ موجودہ صورت میں اس کے تین طرف اس کی حصاری

حصاری دیواریں ہیں۔ ان دیواروں میں دو دو مقامات پر محرابی دروازے ہیں۔ جن میں تالاب میں اترنے اور نہانے
وغیرہ کے لئے ۱۱ - ۱۱ سیڑھیاں ہیں۔ مشرقی تمام سرحد پر نہایت لمبی لمبی اور چوڑی پتھر کی سیڑھیاں ہیں۔ اس کے وسط
میں نہایت شاندار چبوترہ ہے۔ جو تھوڑا سا تالاب کے اندر کی طرف نکالا گیا ہے۔ مغربی کنارے پر ایک پختہ
شاندار عمارت ہے۔ جسے "گومٹی" کہتے ہیں۔ اور جو کھنڈر بنتی جا رہی ہے۔ اس کے وسط میں شاندار مگر مختصر
"ھال" ہے۔ اس کے دونوں طرف کھلے در کے کمرے ہیں۔ چاروں کونوں میں چھوٹے چھوٹے حجرے کے انداز کے کمرے ہیں۔
انہیں سے اوپر جانے کے لئے زینہ چڑھتے ہیں۔ اس عمارت کے مشرق اور مغرب میں سہدریاں ہیں۔ مشرقی سہ دری
تالاب کے اوپر ہے۔ اس کے نیچے تالاب میں ایک سہ دری اور ہے۔ اوپر کی سہ دری کے دونوں طرف سے اس سہ دری
میں زینے اترتے ہیں۔

اس سہ دری کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اس کا تعلق براہ راست دریائے جمنا سے تھا اور اس میں سے تالاب
میں پانی آتا تھا۔ جمنا یہاں سے تقریباً ۲ میل ہے۔ تالاب کے جنوب کی طرف ایک چھوٹی سی نہر ہے۔ جو ایک
دوسرے چھوٹے تالاب سے جڑی ہوئی تھی۔ اس کے ذریعہ تالاب کا گندہ پانی اس دوسرے تالاب میں لایا جاتا ہے
اور یہاں سے یہ پانی دو تین میل دور ایک جھیل میں، جو جھیل خاص کہلاتا ہے، پہنچا دیا جاتا تھا۔ یہ چھوٹا تالاب
تو موجود نہیں ہے مگر اس کی پختہ حصاری دیواروں کے موجودہ کچھ کھنڈرات اس کی نشان دہی کرتے ہیں
بڑے تالاب میں سال کے سال کم و بیش برساتی پانی رہتا ہے۔ اس کے چاروں طرف لہلہاتے کھیت ہیں۔

اس تالاب کے متصل شمالی حصہ میں جو شہری آبادی شروع ہوتی ہے۔ اُسے محلہ "نواب دروازہ" کہتے
ہیں۔ اس لئے کہ اس کے دونوں طرف نواب مقرب علی خاں کے دور کے دو بلند اور شاندار دروازے
ابتک موجود ہیں۔ جو غالباً اس احاطہ کے گیٹ ہیں۔ جس میں باغ سے متصل نواب کی رہائشی عمارتیں ہونگی۔
اگرچہ ان رہائشی عمارتوں میں سے کوئی کھنڈر اب موجود نہیں۔ مگر جگہ جگہ ان کی بنیادوں کے نشانات اس
حقیقت کی عکاسی کر رہے ہیں۔ ان دروازوں میں شمالی دروازہ چھوٹا بھی ہے اور شاندار بھی نہیں ہے۔ مگر
مشرقی دروازہ نہایت عظیم الشان ہے۔ اس دروازہ کے دونوں پہلوؤں میں، اوپر نیچے دو، دو چھوٹے چھوٹے حجرے
ہیں، نیچے کے حجرے غالباً پاسبانوں کے بیٹھنے کے لئے تھے۔ اُن حجروں میں سے اوپر جانے کے لئے زینے چڑھتے
تھے۔ اوپر کے حجروں سے باہر کی طرف بڑی خوبصورت بالکونیاں نکلی ہوئی ہیں۔ نیچے کے حجرے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں مگر
دروازہ ابھی مجموعی اعتبار سے سربلند کئے۔ اس دور کی داستان پارینہ کو سُنا رہا ہے۔

تالاب کے مشرق میں کچھ کھیت پار کرنے کے بعد جو محلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ محلہ دربار کہلاتا ہے۔
جو اس وقت پختہ چار دیواری سے محصور تھا اور اس میں نواب کے عزیزوں اور درباریوں کے مکانات تھے اور
محلہ کی وجہ تسمیہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ "نولکھا باغ" کی سیر کے لئے جہانگیر کی آمد کے وقت موکب
شاہی نے یہیں قیام کیا تھا۔ اور شاہی دربار منعقد ہوا تھا۔

اس محلہ کے دونوں طرف بھی دو بلند دروازے تھے۔ مشرقی دروازہ چھوٹا تھا۔ اس لئے اس سے منسلک محلہ کو چھوٹا
کہتے ہیں۔ یہ دروازہ گزشتہ چند سالوں کے درمیان مرورِ زمانہ کی نذر ہوگیا۔ شمالی دروازہ کافی شان دار
ہے۔ اور اس دور کی عکاسی کے لئے ابھی موجود ہے۔ اس دروازہ سے منسلک محلہ کو دربار کلاں کہتے ہیں۔
دونوں دروازوں سے محصور محلہ دربار میں اب اس دور کا کوئی تاریخی یا اس کے کھنڈر موجود نہیں۔ مگر بڑے
دروازہ کے قریب ہی محلہ دربار کلاں میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے دونوں بھائیوں کے مکانات
ابھی تک صحیح سالم صورت میں موجود ہیں۔ جو نواب مقرب علی خاں کے دور کی نشانی تو نہیں لیکن
کیرانہ کی تاریخ کے آخری اوراق ضرور ہیں۔

اس محلہ کے مشرق میں ایک شاندار مسجد ہے جو "مسجد دربار" کہلاتی ہے۔ یہ کیرانہ میں نواب
مقرب علی خاں کے دور کی ایک گراں قدر یادگار ہے۔ اس مسجد کو جہانگیر کی کنیز صاحب سلطان نے
بنوایا تھا۔ اس مسجد کا یہ بھی ایک امتیاز ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب یہیں نماز پنجگانہ ادا کرتے
اور مطالعہ کتب یا عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ اسی کے حجرہ میں اپنی مشہور تالیف "ازالۃ الاوہام"
مرتب فرمائی۔

کیرانہ کی تاریخی عظمت اور اس کی عالمی شہرت میں بانیٔ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سے
اس کی وطنی نسبت کو بہت بڑا دخل ہے۔ حضرت مولانا اور ان کے خاندان کے علمی و تمدنی کارنامے کیرانہ
کی تاریخ کے سنہری اوراق ہیں مگر حضرت کا مسکونہ مکان جو ابھی تک اپنی پوری وضع قطع کے ساتھ موجود ہے۔ وہ
نہ صرف کیرانہ بلکہ ہندوستان سے لیکر سعودی عرب تک ایک "کاشانۂ رحمت" ہے اور اس کے ساتھ ان
دونوں بھائیوں کے مکانات بھی کیرانہ کے "آثار الصنادید" میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کا اپنا رہائشی مکان محلہ دربار کلاں میں اس محلہ کے بڑے
شمالی دروازہ کے پاس ہی ہے۔ ویسے تو یہ ایک اوسط درجہ کا مکان ہے۔ مگر حسنِ عقیدت اور برکت کے
اعتبار سے بڑا عظیم المرتبت ہے۔ یہ چھوٹی اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ جو اس علاقہ میں "لکھوری اینٹ" کہلاتی ہے
اس کا دروازہ شمال رویہ ہے۔ اس وقت دہلیز چھپی ہوئی تھی۔ مگر اب غیر مسقف ہے۔ دروازہ کے کیواڑ، اسی
دور کی یادگار ہیں۔ جو اس زمانہ کے روایتی انداز کے نہایت پختہ بنے ہوئے ہیں۔ اندر مکانیت میں ایک شرق
رویہ سہ دری ہے۔ جس کے ستون پتھر کے ہیں اور اس دور کی سنگتراشی کا روایتی نمونہ ہیں۔ اس کے پیچھے نیم
دری ہے۔ جس کے بیچ کا در پورا ہے۔ اور اِدھر اُدھر کے "دو نیم در ہیں۔ اسی لئے عام طور پر اس قسم کے مکان
نیم دری کہتے ہیں۔ اس نیم دری کے دروازے، اسی وقت کے کیواڑ اور چوب سے آراستہ ہیں۔ سہ دری کے
سامنے ایک پختہ چبوترہ ہے۔ چبوترہ کے جنوب کی طرف ایک کھلے در کا باورچی خانہ ہے۔ صحن میں جنوب ہی کی طرف
اور شمال رویہ سہ دری ہے۔ جس کے ستون اینٹوں کے ہیں۔ مگر اس کے در کھلے ہوئے نہیں بلکہ انہیں

چوکھٹ اور کیواڑ چڑھے ہیں۔ اس سہدری کی بغل میں جانبِ شرق ایک اور کوٹھری ہے جس کا ایک در اس س
میں اور دوسرا دروازہ باہر ہے۔ یہ کوٹھری حضرت مولانا کی کسی وقت بیٹھک تھی۔ جسمیں نور و عرفان کی بارش
ہوتی تھی۔ مگر اب بند ہے اور تاریکی و خاموشی کے عالم میں زمانہ کی سرد مہری پر ماتم کناں ہے۔ اس بیٹھک
کے سامنے ایک کنواں ہے جسے مرورِ زمانہ نے پاٹ رکھا ہے۔ مگر کبھی یہاں سے بھی تشنگانِ علم سیر
ہوتے ہونگے۔ حضرت کے مکان میں چبوترے کی برابر میں سے ایک زینہ اوپر چڑھتا تھا اور اوپر چوبارہ تھا۔
اب نہ زینہ ہے اور نہ چوبارہ۔ صرف دونوں کے نشانات ہیں۔ اسوقت اس مکان میں وہ رحمت و برکت کی
بارشیں تو کہاں ہوتیں۔ البتہ یہ غنیمت ہے کہ اس وقت اس میں جو صاحب سکونت پذیر ہیں۔ انھوں نے ا
صاف ستھرا، رنگ وروغن سے آراستہ اور کافی حد تک اچھی حالت میں رکھ رکھا ہے۔

حضرت مولانا کے مکان کے سامنے ہی ان کے بھائی حکیم علی اکبر صاحب کا مکان ہے۔ حکیم صاحب اُس دور کے
بہترین طبیب اور حکیم حاذق تھے۔ حکیم صاحب کا مکان حضرت کے مکان سے بڑا ہے۔ مکان کے اندر تین طرف سہ دریاں
ہیں جنکے ستون چھوٹی اینٹوں کے ہیں۔ درمیان کی سہ دری کے پیچھے نیم دری ہے اور دونوں پہلوؤں میں دو
چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں۔ یہ مکان یکمنزلہ ہے جو ابھی اگرچہ اپنی اصلی وضع قطع کے ساتھ کھڑا ہے۔ مگر اتنا
بوسیدہ اور کمزور ہے۔ اس کی مرمت کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مولانا کی سعودی عرب سے ہجرت کے بعد حضرت کے بھتیجے صدیق صاحب جو حکیم علی اکبر کے فرزند تھے۔
حضرت کے مکان میں رہنے لگے تھے اور یہ مکان بیٹھک کے طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا۔ چنانچہ مولوی
محمد سعید صاحب ناظم اول مدرسہ صولتیہ فرزند محمد صدیق، جو حضرت کے فرزند برادر زادہ تھے۔ جب
سعودی عرب سے واپس آکر کیرانہ میں مقیم ہوئے تو چونکہ مولوی محمد سعید صاحب کی تعلیم و تربیت بھی
حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے آغوشِ علم و فضل میں ہوئی تھی، اور وہ خود بھی ایک اچھے عالم تھے۔
اس لئے یہ بیٹھک ایک عرصہ تک مولوی سعید کی برکت سے محفل نور و عرفان اور علماء و مشائخ کی آماجگاہ
بنی رہی۔ تیسرا مکان جو مولانا کے مکان کے مغرب میں ہے اور جو ابھی تک حضرت مولانا کی خاندانی عظمت کی اہم
یادگاروں میں ہے حضرت کے بھائی مولوی جلیل صاحب کا ہے۔ یہ مکان اس دور کا پورے کیرانہ میں بڑے شاندار
اور جلیل القدر مکان تھا۔ دراصل اس مکان کی شان و شوکت کے بڑھانے میں مولوی بدر الاسلام صاحب کا بہت
بڑا دخل ہے۔ جو مولوی جلیل صاحب کے فرزند اور حضرت مولانا کے بھتیجے تھے، جنھیں حضرت نے عرب بلاکر سلطان
عبدالحمید سے شاہی کتب خانہ کا مہتمم بنوادیا تھا۔ اس مکان میں دو بڑی بڑی عظیم الشان سہ دریاں ہیں اور انکے
پیچھے اس شان کی نیم دریاں ہیں۔ آگے بڑے بڑے چبوترے ہیں۔ پہلو میں باورچی خانہ اور اسٹور روم ہیں۔ مکان
سے متعلقہ ایک مہتم بالشان بیٹھک ہے۔ جس میں ایک بڑی سہ دری اور نیم دری، اس کے برابر میں ایک بہت بڑا دالان
اور اس کے پیچھے ایک بڑا کمرہ ہے۔ اس بیٹھک سے متعلق بہت بڑی دہلیز ہے۔ جس کا دروازہ نہایت شاندار

روایتی فنکاری اور حسن وخوبی سے مزین ہے۔ اس مکان اور بیٹھک کو مولوی بدر الاسلام صاحب کے فرزند نو ہادی نے جو پاکستان ہجرت کر گئے، کئی لوگوں کو فروخت کر دیا۔ جنھوں نے مکان اور بیٹھک دونوں کے حصے بخرے کر کے اس کی تاریخی عظمت اور اصل شان وشوکت کو قابلِ افسوس حد تک تباہ کر دیا۔

بہرحال پایۂ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے جہاں علمی اور اسلامی دنیا کو اپنی معرکۃ الآرا تصانیف کے شہ پاروں سے مالامال کیا۔ ہندوستانی کی آزادی کی تاریخ کے باب اول میں اپنے مجاہدانہ کارناموں سے مزین کیا۔ حجاز مقدس کو مدرسہ صولتیہ جیسا علم و دانش کا نذرانہ دیا۔ وہاں اپنے وطن مالوف کیرانہ کو اپنے مکان مسکونہ اور اپنے دو اور خاندانی مکانوں کی نہایت ہی قابلِ احترام اور گراں قدر یادگاریں بھی عطا کی ہیں۔ حضرت کے یہ عطیات اگرچہ ابھی اپنے صحیح نقش ونقوش کے ساتھ موجود ہیں۔ مگر خیال یہ ہے۔ کہ رفتہ رفتہ مرورِ زمانہ کے ساتھ۔ یہ بھی گردش دوراں کے نذر ہو جائیں گے اور کیرانہ ان بیش قیمت گوہر پاروں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے گا۔ جیسا کہ نواب مقرب علی خاں کے دور کی تمام یادگاریں باوجود اپنی تاریخی شوکت وعظمت کے محکمہ "آثار الصنادیہ" کا تحفظ نہ ملنے کی وجہ سے وقت کے ساتھ ساتھ کھنڈرات میں بدل گئیں اور بدلتی جا رہی ہیں۔ اسی طرح حضرت کی ان مقدس نشانیوں کو بھی اگر کسی قسم کا کوئی تحفظ نہ ملا تو یہ بھی "غبارِ راہ" بن جائیں گی۔

اس لئے ضرورت یہ ہے کہ اربابِ فکر ونظر، اس طرف خاص توجہ دیں اور حضرت مولانا سے کسی قسم کی بھی نسبت رکھنے والے اہلِ ذوق وشعور آگے آئیں۔ اور حضرت کی ان یادگاروں کو محفوظ رکھنے کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار کریں۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ حضرت کے نام سے ایک ٹرسٹ اور تنظیم قائم کی جائے۔ اور اور اس کے تحت حضرت کی تصانیف کو زیادہ سے زیادہ شائع کرایا جائے اور حضرت سے متعلق ان مکانوں کو حاصل کر کے ان میں اسلامی لائبریری اور دینی وعلمی درس گاہ جیسے ادارے حضرت کی یادگاریں قائم کئے جائیں جس سے حضرت مولانا کے یہ عطیات ویادگاریں بھی محفوظ ہو جائیں، اور ان کے نظریات اور مجاہدات بھی زندہ جاوید بنے رہیں۔

توصیف علوی، بی۔ اے، کیرانوی
ہیڈ ماسٹر، مکتبہ اسلامیہ، کیرانہ

شیخ الاعظم مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا حامد الانصاری غازی صاحب

میرٹھ سے ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی شروع ہوئی تھی۔ یہ جنگ باطل کے خلاف حق کی کھلی ہوئی بغاوت تھی۔ ایسی بغاوت جس نے انگریزی غلامی کے منصوبوں کو تہ وبالا کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس جنگ کے نتیجہ میں تیموری سلطنت قربان ہوگئی۔ لال قلعہ کا تخت بہادر شاہ ظفر کی بادشاہی سے محروم ہوگیا۔ تیموری شہزادوں کے سر کاٹ کر تشت میں رکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے اور سرخرو ہوئے۔ شاہجہانی مسجد پر انگریزی قبضہ ہوگیا۔ قطب مینار کی بلندی کم ہوگئی اور تاج محل کا لاثانی حسن ماند پڑ گیا۔ دلی کا مقدس دریا جمنا جو ہر صبح شاہی قلعے کو سلامی دیکر آگے بڑھتا تھا۔ اس کا پانی خون ہوگیا اور یہ خون جو ایک ساتھ بہا۔ جنرل بخت خاں نانا صاحب پیشوا، مولانا احمد اللہ اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی کا تھا تاکہ تاریخ گواہ رہے کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا خون بھی شامل تھا۔

آزادی کی اس جنگ میں شاملی کے میدان میں پاکانِ خدا کا ایک قافلہ مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے شریک تھا۔ جس کے سپہ سالار حضرت مولانا حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی تھے۔ اس قافلہ کے مجاہد سالاروں میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد ضامن شہید، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صف اول ہی میں تھے۔ انھیں بزرگوں میں آزادی کے آسمان پر ایک اور روشن ستارہ تھا جو اپنی مثال آپ تھا۔ رحمت اللہ کیرانوی۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی خاندانی طور پر ایک تاریخی شخصیت تھے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ الشیخ عبدالرحمن کازرونی تھے جو سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ہند آئے اور پانی پت میں جلوہ افروز ہوئے۔ حضرت کبیر الاولیا مخدوم جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ ایسے روحانی بزرگ اسی خاندان میں پیدا ہوئے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ علوم وفنون میں اعلم زمان تھے۔ روحانیت میں مقام رشد وتقویٰ پر فائز تھے اور جنگِ آزادی کے جانباز مجاہد تھے۔ جنکی لاکھوں کی جائداد کوڑیوں میں نیلام کی گئی۔ آپ نے نہ اعتراض کیا نہ دعویٰ دائر کیا اور نہ اپیل کی بلکہ اسلام کی سربلندی اور ملک کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

برطانوی شہنشاہیت نے ہندوستان کے عوام کو غلام بنا لینے کے بعد ایک خطرناک منصوبہ تیار کیا۔ جس میں ایک طرف لارڈ میکالے تھے۔ جنھوں نے انگریزی تعلیم کے ذریعہ ہندوستان کی تہذیبی روح کو ختم کرنے کا خطرناک پلان

بنایا اور دوسری طرف پادری فنڈر کو لندن سے بھیجا گیا تاکہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کو عیسائی بنا کر دونوں مذہب
خاتمہ کر دیا جائے۔

وہ عالم، مرد مجاہد، روحانی دانشور جس نے اس منصوبہ کے سر پہ پہلی ضرب رسید کی۔ تاریخ اُسے مولانا
رحمت اللہؒ کیرانوی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس نے عقیدے سے عقیدے کو، علم سے علم کو اور منطق سے منطق کو
ٹکر دی اور عیسائی منصوبے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ انھوں نے پادری فنڈر کو مناظرے کے میدانوں میں کئی بار
شکست دی اور اُسے شکست قبول کرتے اور ملک سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ آج ہم مسلمان اسلام پر قائم ہیں، اور
ہماری روحیں عیسائیوں کی غلامی اور عیسائی عقیدے سے آزاد ہیں۔ یہ مولانا رحمت اللہ مرحوم کی عظیم کرامت
ہے اگر مولانا میدان میں نہ آتے تو پورا ہندوستان ناگالینڈ بن جاتا۔ صرف مسلمانوں ہی پر نہیں بلکہ ہندوؤں
پر بھی مولانا کا احسان ہے۔ اگر آج آزاد ہندوستان میں ہمیں عقیدے کی ضمیر کی اور اظہار کی آزادی ہے
تو اس میں مولانا رحمت اللہؒ کیرانوی کے خون کا پورا پورا حصہ ہے۔ اگر ہندوستان کی تاریخ خاموش ہے
تو اسے مولانا رحمت اللہ کا نام جنگِ آزادی کے مجاہدین میں شامل کرنا چاہیئے۔ اگر تاریخ نگار نہیں
جانتے تو انھیں مظفرنگر کے تاریخی ریکارڈ کو جاننے کے لئے ڈاکٹریٹ کی ایک نئی ڈگری کا سامان کرنا چاہیئے
چونکہ مظفرنگر مضافاتِ دہلی میں شمار ہوتا ہے اس لئے یہ کام دلی یونی ورسٹی یا نہرو یونی ورسٹی کو کرنا چاہیئے۔
۱۸۵۷ء کے قافلۂ علم کے سالار حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ تھے۔ جنھوں نے دیوبند
میں اسلام کی سربلندی اور آزادی کے لئے ایک چھاؤنی قائم کی اور اس کا نام مدرسۂ دیوبند رکھا۔
جسے دار العلوم کے نام سے تاریخی شہرت حاصل ہوئی۔ مولانا محمد قاسم کا نظریہ تھا "العلم قوۃ" علم ایک طاقت
ہے اور اس طاقت کو استعمال کر کے ہندوستان اپنی روح تہذیب اور اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتا ہے۔ حضرت
مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اسی نظریہ کے مطابق ایمانی قوت کا ایک کارخانہ قائم کیا اور اس کا نام مدرسہ صولتیہ
رکھا گیا۔ علم مکہ معظمہ سے چل کر ہندوستان آیا تھا۔ ہندوستان کے علماء کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس علم کو
پھر مکہ معظمہ پہنچا دیا۔ مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ کا درجہ آج کی یونی ورسٹیوں سے بالاتر ہے۔ یہی وہ مدرسہ
ہے جس نے جزیرۃ العرب (سعودی عرب) کے علماء دانشور اور حکومت کے ذہین افراد پیدا کئے ہیں۔ یہاں کے
استاذ ہی نہیں استاذ الاساتذہ پیدا ہوئے۔ صولتیہ کا فیض ایشیا و افریقہ میں جاری ہے۔ یہاں دین ہے
دین کے ساتھ دانش ہے اور دانش کے ساتھ حکمت ہے۔ اور حکمت کی تقویٰ ہے اور یہی تقویٰ ہے جو دین
اور دنیا دونوں کو سنوارتا ہے اور آخرت کو باغ و بہار بناتا ہے۔ کیونکہ تقویٰ فاتحِ عالم ہے۔
مولانا رحمت اللہؒ کیرانوی مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی کا شمار ان مجاہد علماء
دین میں ہے جنھوں نے ابو الکلام آزاد، موہن داس کرم چند گاندھی اور جواہر لال نہرو سے پچاس سال
پہلے ہندوستان کے لئے اپنا خون پیش کیا۔

مولانا رحمت اللہ کو ترکی خلافت سے خلعت اور اعزاز ملا۔ وہ ترکی خلافت جس کے جہاز بحر روم، بحر اسود، بحر قلزم اور خلیج عربی و فارسی پر حکمراں تھے۔ مولانا کا بڑا شرف یہ ہے کہ انھوں نے مکہ معظمہ کو ہجرت کی اور مکہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔ وہ آج دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی چھاؤنی سے نکلے ہوئے لشکر زندگی کے جہاد میں انسانیت کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

میں نئے دور کے رہنماؤں، دانش وروں، پروفیسروں، مورخوں، ادیبوں سے عرض کرونگا کہ کارل مارکس وزرا ئیلی، فرائڈ، آئن سٹائن، برنارڈ شا، اور ہالی ووڈ کے اس دور میں ہندوستان کے ان تاریخی شخصیتوں کی بلندی کا کھوج لگانے کی کوشش کریں جو ہمالیہ پہاڑ سے بھی زیادہ عظیم اور بلند ہیں۔

ہندوستان تاریخ میں بڑا رہا ہے۔ آج بھی بڑا ہے۔ آئندہ بھی بڑا رہے گا بشرطیکہ ہم نے اپنی تاریخ کے عظیم رہنماؤں کو یاد رکھا اور اپنی نئی نسل کو یہ بتا دیا کہ اس ملک کی بڑائی اس کے تاریخی اشخاص کے کارناموں میں ہے اگر ہم اس میں ناکام رہے تو تاریخ ہی کے صفحہ پر یہ لکھا ہوا ملے گا کہ یہ ملک ہزاروں سال سے بڑا تھا مگر اب بڑا نہیں رہا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی تاریخ کے بزرگوں کو بھلا دیا اور ان سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی یادگاریں ان کی کتابیں ہیں۔ جن میں اظہار الحق کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ ان کا یہ شاہ کار کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کی سب سے بڑی یادگار مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ ہے۔ حضرت کی وفات کے بعد اس ادارہ کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی سرپرستی حاصل رہی۔ آپ کے بھتیجے حضرت مولانا محمد سعید کیرانوی، جو حق پرست اور حق شناس تھے وہ امتحان کے دور میں اس کے مہتم رہے۔ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد سلیم، جو علم و حکمت اور دین و دانش کے اعتبار سے عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے دورِ اہتمام میں مدرسہ صولتیہ نے زبردست ترقی کی اور اسے ایک عظیم یونی ورسٹی کے برابر اعتبار حاصل ہوا۔ اب ان کے خلف الرشید جناب مولانا محمد شمیم مدظلہ العالی مدرسہ صولتیہ کی علمی، تعلیمی، تربیتی ترقی کے لئے دن رات سرگرم ہیں۔ ہم سب کا فرض ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی یادگار مدرسہ صولتیہ کی ترقی اور توسیع کے لئے جان سے، مال سے، دل سے امداد کریں اور عظیم ثواب حاصل کریں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ردِ مسیحیت

جناب محمد انیس الرحمٰن قاسمی صاحب

چھٹی صدی میں حضرت مسیح کی شریعت بہت نازک مرحلے میں تھی۔ اس کے اندر اتنی قوت نہ تھی کہ وہ زندگی کی زمام سنبھال کر انسانیت کی راہنمائی کرسکے۔ اس کے اصول وقواعد اور فروغ ومسائل پر اوہام ورسومات کے گرد وغبار پڑے ہوئے تھے۔ سن ۶۱۰ء میں جب فاران کی چوٹیوں سے اسلام کا آفتاب بلند ہوا تو اس کی کرنوں نے تہہ در تہہ تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے حضرت مسیح کی تعلیمات کو اُجاگر کیا۔ اور نبئ عربی گی نازل شدہ لاہوتی کتاب نے توریت وانجیل کو محرف بتلاکر تثلیث کی تردید کی اور حضرت مسیح کی مقدس زندگی پڑے ہوئے صلیب وکفارہ کی آلائشوں کو دور کیا۔ توحید کی دعوت دی اور اقانیم کی تردید کی اور رہبانیت کی جگہ ربانیت کو پیش کیا۔

نبئ آخر الزماں کے بعد ان کے مقدس شاگردوں نے اسلام کے نورِ جہانتاب سے کلیساؤں کو روشن کیا اور تثلیث کے معبدوں کو توحید کی مسجدوں میں بدلا۔ صحابہ کرام کے بعد ان کے جانشینوں نے اس کی کوشش کی۔ چنانچہ اسلام آگے بڑھتا رہا اور عیسائیت پیچھے ہٹتی رہی۔ مگر اس کے بعد دوسری صدی ہجری سے دونوں میں بڑی زبردست کشمکش شروع ہوئی اور بعض مرتبہ اس میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ توحید کو آگ اور خون کے سمندروں سے گزرنا پڑا۔ یہ سلسلہ اٹھارھویں صدی تک چلتا رہا۔ یہانتک کہ انیسویں صدی نے ہندوستان میں ایک قیامت خیز قدم رکھا اور توحید تثلیث کے گرداب میں آگئی۔

وہ وقت بڑا نازک، صبر آزما اور حوصلہ شکن تھا۔ جب انگریز نے اپنی مادی فتح مندیوں کے ساتھ مسلمانوں کے روحانی قلعوں پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور سیاسی استقرار واستحکام کے لئے ایک مستقل اور ہمہ گیر تحریک ہندوستان کے مختلف شہروں دہلی، آگرہ، پٹنہ، رانچی، گلبرگہ، شولاپور اور حیدرآباد وغیرہ میں شروع کر رکھی تھی جس کے ساتھ عیسائی مبلغوں اور انکی تقریروں وکتابوں کا ایک سیلاب تھا جو وحدانیت کو بہالے جانا چاہتا تھا۔

ایک عرصہ تک تو عام مسلمان، عیسائیوں کے وعظ سننے اور ان کی کتابوں اور رسالوں کے پڑھنے سے احتراز کرتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ انکی آزاد تقریروں اور تنقیدوں نے بعض ناواقف مسلمانوں کو اپنے دام تزویر میں لے لیا۔ ابتداء میں تو علمائے کرام نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ مگر جب پادریوں نے عام شاہراہوں اور سڑکوں سے گزر کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر شعلے اگلنا شروع کیا تو علماء کرام کی ایک جماعت فتنہ کی سنگینی کو محسوس کرکے

…ے لئے کھڑی ہوئی اور قلمی ولسانی، تحریری اور تقریری طریقہ پر ان کی تردید کی۔ ان ربانی علماء کی اس جماعت میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی (۱۳۰۸ھ)، ڈاکٹر وزیر خاں مرحوم، مولانا سید آل حسن (۱۲۸۶ھ) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۹۶ھ)، مولانا شرف الحق صدیقی (۱۳۵۴ھ) اور حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ (۱۳۶۳ھ) خاص طور پر پیش پیش تھے۔ [1]

ان حضرات نے مالی بے کسی اور بے سروسامانی کے باوجود ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی مشنری کا مقابلہ کیا اور نشتر کے قریب ان کے رد میں کتابوں کو لکھا۔ بلکہ بعض علماء نے تو اپنی زندگی کا مقصد ہی اسی کو بنا کر اپنے ذہن و دماغ اور قلب و روح کی تمام قوتیں اس میں صرف کر دیں۔ چنانچہ مولانا باقر علیؒ نے خاص طور پر اس کے لئے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کو دار پر بھی چڑھنا پڑا اور اس طرح گویا حیات کا آخری قطرہ بھی انھوں نے گلشنِ توحید کی آبیاری کے لئے پیش کر دیا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب بھی ابتداء میں دوسرے علماء کی طرح خاموش تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے استاد شاہ عبدالغنی صاحب نے پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" کی تردید کا اشارہ کیا۔ جس پر آپ نے ساڑھے پانچ سو صفحے پر مشتمل "ازالۃ الاوہام" کے نام سے ایک کتاب مکمل کی اس تالیف کے بعد جب ۱۸۵۴ء میں آگرہ تشریف لئے گئے تو وہاں میزان الحق کے مولف پادری فنڈر کی موجودگی کی اطلاع ملی۔ جس نے اپنی کتاب اور تقریروں کے ذریعہ عوام کے اندر ایک دہشت پیدا کر دی تھی۔ اس لئے آپ نے محسوس کیا کہ اس کا موثر مقابلہ اس وقت نہ ہو سکے گا۔ جب تک کہ پادری فنڈر کے ساتھ مجمع عام میں ایک فیصلہ کن مناظرہ کر کے عیسائیت کی کمر نہ توڑ دی جائے تاکہ عوام کے قلوب سے ان کا خوف و رعب دور ہو جائے اور وہ پہچان لیں کہ دلیل و حجت کے میدان میں اس کے اندر کتنی سکت ہے۔

اس ارادہ کے ساتھ فنڈر سے ملاقات کر کے مناظرہ کی تجویز رکھی، اور ۱۸۵۴ء میں آگرہ کے اندر دو مشہور مناظرہ کئے جس نے ان کی دہشت گردی کو ختم کر دیا۔ یہ مناظرہ جو عام مجمع میں ہوا، بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اس لئے اس میں فتح ہوتے ہی علمی دنیا میں عیسائی مبلغوں کی شکست ہو گئی۔

مناظرہ کے بعد تین سال تک مسلسل عیسائیت کے خلاف آپ کا قلم چلتا رہا۔ جس میں پادریوں کی مختلف کتابوں کے رد میں سات کتابیں (۱) اعجازِ عیسوی (۲) بروق لامعہ (۳) معدل اعوجاج المیزان (۴) تقلیب المطاعن (۵) ازالۃ الشکوک (۶) احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث اور (۷) البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف کے ناموں سے اُردو اور فارسی میں لکھی۔ یہ جہاد جاری تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رستخیز برپا ہو گیا اور آپ قلمی ولسانی فتح کے بعد سیفی و سنانی جہاد میں شامل ہو گئے۔ [2]

---

[1] فرنگیوں کا جال [2] آثارِ رحمت

جب یہ ہنگامہ فرو ہوا تو حکومت کی طرف سے دار و گیر کا ایک سلسلہ شروع ہو جس میں بہت سے ابطال اسلام کو تختہ دار پر چڑھنا پڑا کچھ کو کالے پانی کی تکلیف دہ اذیتوں میں بتلا کیا گیا اور کچھ لوگ اپنی عزت و آبرو اور جان کی حفاظت کی خاطر حجازِ مقدس چلے گئے۔ حضرت مولٰنا کا بھی وارنٹِ گرفتاری جاری ہوا۔ مگر آپ چھپ کر حجاز مقدس چلے گئے اور گرفت میں نہ آسکے۔

یہ سلطان عبد العزیز خاں (سلطان ترکی) کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اور حکومت نے مسجد حرام میں دینی علوم کی اشاعت کی خاطر حدیث و فقہ اور تفسیر و علمِ کلام کے مشائخ کو تدریس کی ذمہ داری سپرد کردی گئی تھی۔ اُس وقت شیخ حرم سید احمد دحلان تھے۔ ان سے جب شناسائی ہوئی تو وہ آپکے نقطہ، جامعیت، وسیع النظری اور علمیت سے کافی متاثر ہوئے اور مسجد حرام کے شیوخ میں آپکا نام درج کر لیا اور آپ درس دینے لگے۔

یہ تدریسی شغلہ جاری تھا کہ پادری فنڈر، جس کو آپ نے آگرہ کے مناظرہ میں شکست فاش دی تھی۔ وہ ۱۸۵۷ء کے بعد جرمنی، سوئزرلینڈ اور انگلینڈ ہوتے ہوئے لندن کی چرچ مشنری سوسائٹی کے حکم سے قسطنطنیہ پہنچا اور سلطان عبد العزیز خاں سے مل کر یہ عرض کیا کہ ہندوستان میں میرا ایک مسلمان عالم سے مناظرہ ہوا تھا۔ جس میں عیسائیت کو فتح اور اسلام کو شکست ہوئی۔ سلطان کو دینی امور سے بے حد شغف تھا۔ اس لئے وہ یہ سن کر بہت فکر مند ہوئے اور مکہ کے گورنر شریف عبد اللہ بن عون کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ حج کے زمانہ میں جو ہندوستان کے باخبر حضرات آئیں۔ ان سے پادری فنڈر کے مناظرے اور انقلاب، ۱۸۵۷ء کے خاص حالات معلوم کر کے بابِ خلافت کو مطلع کیا جائے۔ جب یہ فرمان پہنچا تو مولٰنا مکہ ہی میں تھے اور آپکے کارناموں سے امیر آگاہ تھا اس لئے اس نے اس کی اطلاع سلطان کو دی اور اس کے بعد سلطان کی طلب پر ۱۸۶۴ء میں آپ خاص اعزاز و اکرام کے ساتھ شاہی مہمان کی حیثیت سے استنبول پہنچے۔ سلطان نے باریابی بخشی اور آپکے انقلابی کارناموں اور مناظرے کی روداد سن کر مسرت کا اظہار کیا۔ لیکن جب فنڈر کو اس کی اطلاع ملی تو وہ انگلستان چلا گیا اور دوبارہ مناظرہ نہ ہو سکا۔

اس ملاقات میں آپ نے سلطان کو چند قیمتی مشورے دئے۔ جس پر انھوں نے ایک فرمان کے ذریعہ تمام ترکی مسیحی مبلغوں کو قید کرنے کا حکم دیا۔ جو مرکز خلافت میں عیسائیت کو فروغ دینے کے لئے اسلام پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ وہیں سلطان اور وزیر اعظم کی خواہش پر آپ نے عربی میں اظہار الحق کے نام سے وہ شعلہ بداماں کتاب لکھی۔ جس نے عیسائی دنیا کے در و دیوار کو لرزہ براندام کر دیا۔

یوں تو عالمِ اسلام میں حضرت مولٰنا سے پہلے ردّ عیسائیت میں بہت سی وقیع اور علمی کتابیں لکھی گئیں تھیں اور متقدمین و متاخرین میں سے بعض جلیل القدر شخصیتوں نے اس پر قلم اٹھایا تھا۔ اور مفکرین اسلام میں سب سے پہلے جاحظ (۲۵۵ھ) نے ایک مستقل کتاب الرد علی النصاریٰ کے نام سے لکھی تھی۔ پھر ان کے بعد احمد بن ادریس القرافی (۶۸۴ھ) کی الاجوبۃ الفاخرۃ عبد اللہ الرحمان (۸۶۳ھ) کی تحفۃ الاریب فی الرد علی اہل الصلیب، امام غزالی (۵۰۵ھ) کی الرد الجمیل امام ابو البقاء کی تخجیل من حرف التوراۃ

مدد، تابیل، امام قرطبی (۶۱۱ھ) کی الاعلام بما فی دین النصاری من الفساد، ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) کی الجواب الصحیح، اور ابن قیم کی ہدایۃ الحیاری وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔ اسکے علاوہ مفسرین اور متکلمین نے اپنی کتابوں میں کافی تفصیلی بحث کی ہے۔

مگر ان تمام اعلام اسلام کی کاوشوں کے باوجود انیسویں صدی میں عیسائیت کا جو سیلاب آیا تھا۔ اس کے مقابلہ کی ان کتابوں میں سکت نہ تھی۔ اس لئے کہ یہ تمام اندوختہ رومن کیتھولک فرقہ کے مقابلے میں تھا لیکن سولھویں صدی میں جو پروٹسٹنٹ طبقہ پیدا ہوا اور جو ایک نیا نظام ترتیب دیکر رومن کیتھولک کے خلاف آواز بلند کر کے رفتہ رفتہ تمام دنیا میں پھیل گیا تھا اس کے لئے ضرورت تھی کہ کوئی نیا ابن تیمیہ اور دوسرا غزالی وجود میں آئے جو تحلیل و تجزیہ اور تحقیق و تدقیق میں متقدمین کی سی ذہانت رکھتا ہو اور جو قدیم و جدید سے آگاہ ہو اور عیسائیوں کے تمام طبقوں و فرقوں ان کے اختلافات و تنازعات اور عیسائیت کی ترقی و ارتقاء سے باخبر ہو، جسے زبان و بیان اور تحریر و تقریر پر پوری قدرت ہو۔ اللہ نے اس ضرورت کو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے ذریعہ مکمل کیا۔

حضرت مولانا کے زمانہ سے پہلے یورپ میں دو ایسے طبقے پیدا ہو گئے تھے۔ جس نے کھل کر تنقید کی تھی۔ پہلا فرقہ تو پروٹسٹنٹ کا تھا جس نے رومن کیتھولک کی ایجاد کردہ بدعتوں اور کلیسا کی بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اس فرقہ کا پیشوا لوتھر تھا۔ جس نے سترھویں صدی میں پہلی مرتبہ بائیبل کی تشریح و تعبیر کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے کر پادریوں کے ساتھ بائیبل پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی۔ اور پھر اس کے بعد تنقید کا بند دروازہ کھلا تو کھلتا ہی چلا گیا اور مفکرین کی ایک جماعت نے عقلیت کا نعرہ لگا کر عیسائیت کی تار و پود بکھیر دی۔ مگر جب یہ عقلیت کا نشہ چڑھا تو چڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ کوئی عقیدہ اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہا۔ یہاں تک کہ والٹائر (۱۷۷۸ء) جیسے ملحد بھی پیدا ہوئے جنھوں نے سرے سے خدائی کے وجود ہی میں شک کا بیج بو دیا۔ جس کے بعد کھلم کھلا خدا کا انکار کیا جانے لگا۔ لیکن ان ملحدین سے جہاں نفسِ مذہب کے تقدس کو نقصان پہنچا وہاں یہ فائدہ ہوا کہ ان نظریات کی غلطی واضح ہو گئی جن پر عرصہ دراز سے کلیسا تقدس کا لبادہ ڈالے ہوئے تھا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی اس عقلیت زدہ طبقہ کی کتابوں تک ڈاکٹر وزیر خاں کی مدد سے رسائی حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے پروٹسٹنٹ طبقہ جس سے آپ برسرِ پیکار تھے۔ اس کے مقابلہ کے لئے کافی مواد جدید تحقیقات سے حاصل ہو گیا تھا۔ مولانا۔ اظہار الحق میں اُن ملحدین کے اقوال سے استناد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :-

"یورپی ممالک میں ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں۔ جن کو علما پروٹسٹنٹ، ملحد اور بے دین کہتے ہیں جو نبوت اور الہام کے منکر اور مذاہب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مذہب عیسوی کے پیغمبروں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مذہب عیسوی کے پیغمبروں کی بے ادبی کرتے ہیں۔ بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام کی۔

ان ممالک میں ان کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے ان کی کتابیں دنیا کے اطراف میں پھیل چکی ہیں۔ کچھ تھوڑے بہت ان کے اقوال بھی نقل کئے جائیں گے۔ اس نقل سے کوئی صاحب یہ خیال نہ فرمائیں کہ ہم ان کے اقوال کو اچھا سمجھتے ہیں۔ حاشا و کلا (۱)

اس طرح حضرت مولانا کو مسیحیت کے اصلی و نقلی خدوخال پہچاننے میں تین طبقہ نے مدد دی۔ پہلا طبقہ پروٹسٹنٹ کا، دوسرے ملحدین و عقلیت پسندوں نے اور تیسرے علماءِ اسلام نے۔ وہ اپنی کتابوں میں ان تینوں طبقوں سے رجوع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو مسیحی علم کلام پر عبور حاصل ہوگیا تھا۔ ورنہ مسیحی کلام اسلامی علم کلام سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے اور اس پر ابتک سینکڑوں یورپین دماغوں نے دردسری کی ہے۔ مگر بجائے اس دلدل سے نکلنے کے تثلیث و کفارہ اور عشاء ربانی کی عمیق بحثوں میں اور الجھتے چلے گئے ہیں۔ یہانتک کہ انکارِ خدا تک جا پہنچے اور اس سے نکلنے کی کوئی صورت بھی نہ تھی۔ ہاں اگر وہ یورپ کے لحن زادوں کے بجائے عرب کے ریگستانوں کی طرف قدم بڑھاتے تو فاران کی چوٹیوں سے چمکنے والا آفتاب ضرور ان کی راہنمائی کرتا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اظہار الحق کے ذریعہ اسی ریگستان عرب کی طرف رہنمائی کی ہے۔ یہ کتاب ان کی آخری عمر کی ہے۔ اس میں ان کی عمیق فکر اور مجتہدانہ نظر کی جولانیوں کا ظہور ہے۔ اور وہ دونوں قدیم و جدید سمندروں کے شناور نظر آتے ہیں۔ اس کے لئے انھوں نے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی تمام گرانقدر ذخیروں سے استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً جن انگریزی کتابوں سے اس میں مدد لی ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۲) انسائیکلوپیڈیا ریس (۳) تفسیر ہلوان (۴) تفسیر ہنری و اسکاٹ (۵) تفسیر آدم کلارک (۶) لارڈز کی تفسیر (۷) ہارسلے کی تفسیر (۸) واٹس کی کتاب اسالتہ الاوہام۔

یہ ان مسیحی مفکرین کی کتابیں ہیں۔ جنھوں نے تمام قدیم و جدید اقوال و آرا کا احاطہ کیا ہے اور اس میں ان عقلیت پسند طبقہ کی تنقیدات بھی ہیں۔ جنھوں نے عہد عتیق و جدید کی تمام کتابوں میں تناقض ثابت کیا ہے فرقہ پروٹسٹنٹ کے علاوہ رومن کیتھولک کی کتابوں مثلاً عہد عتیق و جدید کا انگریزی ترجمہ تامس اینگلس کی کتاب مراۃ الصدق وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

اس طرح حضرت مولانا نے ان تمام کتابوں کے مطالعہ کے بعد جب ردِّ عیسائیت پر آخری بار قلم اٹھایا تو وہ شاہکار تصنیف وجود میں آگئی۔ جس نے مسیحی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ کتاب اس قدر مبسوط، مدلل، جامع اور مستحکم ہے کہ شاید کسی زبان میں ابتک ایسی کتاب نہیں نکلی ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے اور ابتک اس کے پانچ زبانوں ترکی، انگریزی، فرانسیسی، گجراتی اور اردو میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلی مرتبہ جب اس کا ترجمہ (انگریزی ترجمہ) لندن پہنچا تو لندن ٹائمز نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہب عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی (۲)

(۱) اظہار الحق کا اردو ترجمہ ۲۳۸/۱۹۰ (۲) ایک مجاہد معمار ۲۶

علمائے اسلام کے متقدمین میں سے حافظ، ابن حزم، علامہ عبدالکریم شہرستانی، ابن قیم، ابن تیمیہ
امام رازی، غزالی اور قرطبی وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے۔ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر مولٰنا کی تصنیف کا مطالعہ کیا جائے
تو یہی کہنا پڑیگا کہ

کم ترک الاول الآخر

سنہ ۱۲۸۱ہجری کے بعد اب تک علمائے اسلام کی طرف سے عموماً جتنی کتابیں رد مسیحیت میں لکھی گئیں۔ تمام مؤلفین
نے اظہار الحق کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ عربی مؤلفین میں سے شیخ جزیری اور شیخ باجہ جی زادہ نے اپنی کتابوں میں
اس سے کافی مدد لی ہے اور ہندوستانی علماء میں سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے تفسیر
بیان القرآن میں، حضرت مولٰنا حفظ الرحمٰن صاحب نے قصص القرآن میں اور حضرت مولٰنا محمد علی مونگیری
نے "پیغام محمدی" میں آپکی کتابوں کی بے حد تعریف و توصیف کی ہے۔

مگر حضرت مولٰنا؛ اظہار الحق کی تصنیف کے بعد جب بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ یہ ارادہ رکھتے تھے کہ
کوئی اور دوسری جامع کتاب ردِ عیسائیت میں لکھیں، اس لئے کہ اس میں صرف پانچ ہی مسائل تحریف، نسخ،
تثلیث، رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حقانیت قرآن پر عموماً بحث کی ہے ان کے علاوہ اور بھی چند مسائل
تھے جن پر بحث اس دور کے مزاج و دماغ کے موافق ضرور تھی۔

لیکن حضرت مولٰنا کی یہ آخری آرزو پوری نہ ہو سکی اور وہ بیت اللہ کے جوار میں رب البیت سے جا ملے
رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

جناب ڈاکٹر تنویر علوی صاحب

ایک عہد آفریں شخصیت

مولانا رحمتہ اللہ صاحب کیرانوی پچھلی صدی کی ان اہم شخصیتوں میں سے ہیں علمی اور فکری محاذ پر جن کی ولولہ انگیز فتوحات (Achievements) کو تاریخ ساز کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے مولانا اپنے عہد کے ایک متبحر عالم دین ایک ممتاز معلم حدیث اور ایک بے مثال مناظر حق تھے۔ اُن کا دور غیر معمولی عصری تقاضوں بڑے انسانوں کا دور تھا۔ ان بڑے انسانوں کے درمیان وہ خود ایک بہت بڑے انسان تھے۔ آپ کے علمی مطالعہ میں جو وسعت اور خدمتِ دین کے جذبہ میں جو بالیدگی و قوت تھی، کتب مقدسہ کے متون اور ان سے متعلق علمی مباحث پر جو ذہنی دسترس اور جرح و تعدیل کے علمی ضابطوں اور تحقیقی اصولوں پر جو بصیرت آپ کو حاصل تھی وہ ہر دور میں صرف خواص کا حصہ رہی ہے اور بلاشبہ آپ انہیں خاصگان امت میں سے تھے۔

حضرت مولانا خدا اُن کی روح پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے ایک ایسے ۔ اور انتظامی خدمات کا ہفت رنگ دائرہ ہماری تاریخ کی کئی صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ آپ کا نسبی سلسلہ ذوالنورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔

آپ کے مورث اعلیٰ حضرت عبدالرحمٰن گازرونی مدینہ طیبہ سے گازرون تشریف لائے اور وہاں سے حضرت عبدالرحمٰن ثانی گازرونی نے ترک سکونت فرما کر قصبہ پانی پت کو اپنے قدموں کی برکت سے نوازا۔ آپ کے جد بزرگ حضرت جلال الدین کبیرالاولیاء پانی پتی اسی نسبت کی وجہ سے "گازرونی" کہلاتے ہیں۔ آپ کا خاندان جوارِ دہلی کے قصبات میں آکر بسنے والے بہت قدیم اور بزرگ خاندانوں میں سے ہے۔

حضرت کبیرالاولیا "عہدِ سلطنت" کے بہت بڑے صوفیوں اور روحانی پیشواؤں میں سے ہیں حضرت نے حضرت بوعلی شاہ قلندر قتال سے فیوض و برکات پانے کے علاوہ حضرت شمس الدین ترک پانی پتی سے خلافت حاصل کی اور آپ کے جانشین ہوئے اسی کے ساتھ آپ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے بے تکلف اور محبوب دوستوں میں سے تھے۔ حضرت کی اولاد میں اہلِ تصوف و تحقیق اصحاب شعر و حکمت اور ارباب تدریس و تفکر کا سلسلہ اِدھر سے اُدھر تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

عہدِ مغلیہ میں ہمایوں کے زمانہ سے لے کر عالمگیر کے دورِ آخر تک، اس خاندان کے اصحاب سیف و قلم اور اہل کمال و فن، ممتاز شاہی عہدوں پر فائز نظر آتے ہیں اور مغل دربار سے وابستگی کے دور میں بہت سے کارہائے عظیم انجام دیے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا درجہ نواب مقرب خاں کو حاصل ہے جو اکبر کے طبیب شاہی حکیم حسن بینا المعروف "بہ شیخ الزماں" کے بیٹے اور عہدِ جہانگیری کے جلیل القدر امرا میں سے تھے۔ جہانگیر کے دربار ہی سے اُن کو پنج ہزاری منصب اور "مقرب خاں" کا خطاب عطا ہوا تھا۔

کیرانہ جو حضرت مولانا رحمتہ اللہ صاحب کا وطن مالوف ہے [1] نواب مقرب خاں کی جاگیر میں تھا اور یہ جاگیر شہنشاہ اکبر کی طرف سے ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں عطا کی گئی تھی جو شیخ الزماں اور مقرب خاں نے انجام دی تھیں۔ نواب مقرب خاں نے عہدِ جہانگیری میں اپنے خاندان کے اس "مرکز امارت" کو فن تعمیر اور باغبانی کے بہترین نمونوں سے آراستہ کیا تھا۔

یہاں جو باغ لگایا گیا تھا وہ ایک سو چالیس بیگہ آراضی پر پھیلا ہوا تھا اور پھل دار درختوں کی کثرت کی وجہ سے نولکھا باغ کہلاتا تھا۔ یہ اپنے زمانہ کا بہترین باغ تھا اور اس کی بڑی تعریف کی جاتی تھی خود جہانگیر ایک بار اپنے سفر کشمیر کے دوران اس باغ کی سیر سے محفوظ ہوا تھا۔ یہاں تزک جہانگیری کی وہ عبارت نقل کی جاتی ہے جو اس باغ کی سیر سے متعلق ہے۔

"بست و یکم بہ پرگنہ کرانہ نزول سعادت اتفاق افتاد۔ پرگنہ مذکور وطن مالوف مقرب خاں است آب و ہوائش معتدل و زمینش قابل مقرب خاں دراں جا باغات و عمارات ساختہ چوں مکرر تعریف باغ او بعرض رسیدہ بود خاطر رابسیر آں رغبت افزود۔ روز شنبہ بست و دوم با اہل حرم از سیر آں باغ محفوظ گشتم۔ بے تکلف باغے است بغایت عالی و دلنشیں آنچہ دیوار پختہ دورِ آں برکشیدہ و خیاباں ہا را فرش بستہ یک صد و چہل بیگہ ست و درمیان باغ حوضے ساختہ است طول دو بست و بست درع درمیان حوض حصۂ ماہتابی بست و دو درع مربع و ہیچ درخت گرم سیری و سرد سیری نیست کہ دراں باغ نہ باشد از درختہائے میوہ دار کہ در ولایت می شود چند نہال پستہ ہم سبز شدہ سروہائے خوش قد باندام دیدہ شد کہ تا حال بایں خوبی و لطافت سرو بہ نظر در نیامدہ باشد فرمودم کہ سروہا را بشمار ندسی صد درخت بشمار آمد در اطراف حوض عمارات مناسب احساس یافتہ۔" [آثار رحمت ص ۸۷]

اس بیان سے اس باغ کی سرسبزی و شادابی سرو کے خوبصورت و خوش اندام درختوں کی کثرت کا پتہ نہیں چلتا اس فضا کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے جہاں مغل عہد کے فن باغبانی کی ترقی اس درجہ کمال پر پہنچ گئی تھی کہ اس باغ میں تمام "سرد سیری و گرم سیری" درخت پھل پھول رہے تھے یہاں تک کہ پستہ بھی سرسبز ہو گیا تھا۔

---

[1] راقم الحروف کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ یہ تاریخی قصبہ اس کی زاد بوم اور اس کا آبائی وطن ہے۔

جہانگیر جب اس باغ کی سیر کے لیے گیا تھا تو نواب مقرب خاں صوبہ بہار میں تھے اُن کی طرف سے عمال ریاست نے اکیانوے قطعہ یاقوت چار قطعہ الماس برسم پیش کش نذر گزرانے تھے اور اسی کے ساتھ ایک ہزار خلل بصیغۂ پا انداز اور سو شتر برسم تصدیق پیش کیے تھے ۔

یہ باغ دلکشا تو اب اس تاریخی قصبہ میں باقی نہیں، ہاں اس کے وسط میں تعمیر کیا ہوا تالاب صفۂ ماہتابی، اس کے کنارہ پر بنی ہوئی سیر گاہ دوسرے کنارہ کے قریب بنا ہوا ہشت پہل طلسمی حوض اور نوابی محلات کے کچھ آثار شکستہ و خستہ حالت میں اب بھی عہد رفتہ کی کہانی سنانے کے لیے موجود ہیں۔ نواب دروازہ اور دربار دروازہ جو غالباً مغربی یوپی کے اضلاع سہارنپور، میرٹھ اور مظفر نگر کے سب سے پُر عظمت تاریخی دروازے ہیں ہنوز سر بلند کیے کھڑے ہیں [افسوس ہے کہ حکومت یوپی کے محکمۂ آثار قدیمہ کو ان تاریخی یادگاروں کے تحفظ سے کوئی دلچسپی نہیں]

نواب مقرب خاں کے بیٹے حکیم رزق اللہ عہدِ شاہجہاں و اورنگ زیب کے عمائدین سے تھے۔ صاحب " میر الاقطاب " منشی اللہ دیا نواب کے بھتیجے تھے اور فارسی زبان میں قصۂ رام و سیتا کے مصنف مسیح کیرانوی نواب کے منہ بولے بیٹے تھے ۔ تاریخی لحاظ سے اس زریں عہد کے خاتمہ کے بعد بھی اس خاندان میں اصحاب علم وفضل اور ارباب زہد و تقویٰ نسلاً بعد نسل پیدا ہوتے رہے خاص طور پر علم دین اور فن طب میں اس کے افراد کی دسترس و قدر و منزلت صدیوں تک قائم رہی ایسے خوش قسمت خاندان بہت کم ہوتے ہیں ۔

مولانا رحمت اللہ کے بڑے بھائی حکیم علی اکبر اپنے زمانہ کے ایک بڑے صاحب فن شخص تھے کیرانہ کے بڑے بوڑھوں کی زبان پر اکثر انکا ذکر آجاتا تھا ۔ حکیم اجمل خان کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں صاحب حکیم علی اکبر کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کے علاقہ کے کسی مریض کو خود اُن کی اپنی سفارش کے بغیر نہیں دیکھتے تھے (راقم الحروف کے والد حکیم صدیق احمد علوی نے بھی ابتداءً انہیں سے طب پڑھی تھی اور غالباً انہیں کی سفارش پر حکیم عبدالمجید خاں کی خدمت میں پہنچ کر اس فن کی تکمیل کی تھی) ۔ منشی عادل حسین (مرحوم) جن سے میں نے ابتدائے عمر میں فارسی پڑھی تھی فرماتے تھے کہ حکیم علی اکبر بے حد شریف النفس اور خدا ترس انسان تھے غریب مریضوں کو دیکھنے جاتے تو ان سے فیس لینے کے بجائے اپنی جیب خاص سے اُن کی مدد فرماتے تھے ضعیف العمر و کمزور مریضوں کو کرایہ کے پیسے دیتے تھے ان کا نسخہ ایک عام آدمی کے لئے پیسہ دو پیسہ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا ۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی پیدائش سنہ ۱۲۳۳ ہجری میں ہوئی ۔ آپ کی پیدائش سے پہلے آپ کی والدہ کو ایک خواب کے ذریعہ یہ بشارت دی گئی تھی کہ ان کے گھر میں ایک ایسا چاند طلوع ہوگا جس کی روشنی تمام عالم میں پھیلے گی ۔ آغاز طفولیت ہی سے آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار ہونے لگا بارہ برس کی عمر میں آپ ابتدائی درسیات سے فارغ ہو کر اپنے خالہ زاد بھائی اور مولوی احمد علی کے ہمراہ مزید تعلیم کے حصول کے لیئے دہلی آگئے اور مولوی محمد حیات کے مدرسہ میں مقیم ہوئے اسی اثناء میں مولانا کے والد راجہ ہندو راؤ کو اکبر نامہ پڑھ کر سناتے تھے ۔

اور اپنے والد کو خطوط نویسی میں مدد دیتے تھے ۔ بعد میں خود آپ نے بھی کچھ زمانہ تک راجہ موصوف کی ملازمت اختیار کی ۔

مولینا محمد حیات کے علاوہ آپ نے صاحب آثارِ رحمت کی روایت کے مطابق مولوی امام بخش صہبائی سے فارسی حکیم فیض محمد سے طب اور شاہ عبدالغنی سے دورہ حدیث کی تحصیل کی راجہ موصوف کی ملازمت سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد آپ تحصیل کمال اور تکمیل درسیات کے لیئے لکھنؤ بھی گئے اور مفتی سعداللہ مرادآبادی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شہر دہلی مرجع اہل فضل اور مرکز اصحاب کمال تھا ۔ شاہ عبدالعزیز کے جس مدرسہ میں آپ نے شاہ عبدالغنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اس دار العلم سے حضرت سید احمد شہید حضرت مولینا مفتی صدر الدین مولینا محمد قاسم ، مولینا محمد یعقوب ، مولینا شیخ محمد تھانوی جیسے اکابر نے اکتساب علم و فن کیا ہے اور ان میں بعض حضرت کے زمانے اور حضرت کے ساتھ بھی رہے ہوں گے ۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولینا رحمت اللہ نے اپنے زمانہ کے بڑے علمی مرکزوں اور ممتاز اہل علم سے کسب فیض کیا اسی کے ساتھ آپ جس خاندان اور جس قصبہ سے زندگی اور ذہن کا رشتہ استوار رکھتے تھے اس کے اپنے کردار و ماحول کو بھی آپ کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

اس حقیقت پر ہنوز پوری توجہ نہیں دی جا سکی کہ دہلی اور لکھنؤ جیسے بڑے علمی تہذیبی اور ادبی مرکزوں کے فروغ میں تاریخی قصبوں اور ان سے وابستہ علمی خاندانوں ، فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے خانوادوں اور منفرد اشخاص نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے جس کو نظر انداز کر کے ان کے دائروں میں فروغ پذیر ہونے والے علوم و فنون کے سرچشموں کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا ۔

مولینا تحصیل علم کی جد و جہد سے فارغ ہو کر اپنے وطن کیرانہ چلے گیے اور ایک طور پر گوشہ نشینی کی زندگی گذارنے لگے جو اہلِ کمال کا ایک نشان امتیاز رہا ہے کہ انہیں مسیحی مبلغین اور مغربی مشینریوں کی محاذ بندی غیر علمی طریق کار اسلام کی حقانیت پر اعتراضات و مطاعن کے غیر مختتم سلسلے اور انگریزوں کی سیاسی بالادستی کی وجہ سے مذہبی حلقوں کی ایک گونہ ذہنی مرعوبیت نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اس صورتِ حال پر جو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے مذہبی وقار کے لئے ایک تقاضہ بنتی جا رہی ، صبر کرنے کے بجائے ایک عالمانہ جذبہ جہاد کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں

زمانہ با تو سازد تو با زمانہ ستیز

مذہبی تبلیغ کوئی غلط یا بری بات نہیں بلکہ یہ بڑے مذاہب کی دینی روح کی پہچان کا ایک ذریعہ رہی ہے لیکن مسیحیت کی تبلیغی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اس کے مقاصد کا پس منظر سیاسی منصوبہ بندیوں سے وابستہ رہا ہے اور اس کے ظاہر و باطن کے تضاد نے اس کے علمی طریق رسائی کو بھی متاثر کیا ہے ۔

اسلام ایک سامی مذہب ہے اور اپنے پیشتر آنے والے مذاہب کی حقانیت پر گواہی دیتا ہے لیکن مسیحی مشینریوں نے قرآن پاک کی صداقت رسول اللہ کی نبوت اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر اپنے مزعومہ

بڑی اور دارالعلوم دیوبند کے قیام کے لئے پہلا قدم اُٹھایا گیا۔ مکہ معظمہ اور حرم شریف کے جوار میں اہلِ ہند کی طرف سے اس تاریخی درسگاہ کے قیام اور اس کے فروغ کی مسلسل کوشش ہندوستانی مسلمانوں کی اس ہزار سالہ علمی تاریخ کی طرف ذہن کو منتقل کر دیتی ہے جس کی حدیں روشنی کے دائرہ کی طرح کلکتہ سے قسطنطنیہ تک ایک نور کا ہالا بناتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس مدرسہ کے قیام اور اس کی ترقی کی راہ میں قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں مگر مولینا کے عزم محکم اور عمل پیہم نے ان سب پر قابو پایا اور بالآخر مولینا کی مخلصانہ دینی خدمات کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے والے اربابِ اقتدار نے بھی ان خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا سلطان عبدالحمید نے تین بار مولینا کو قسطنطنیہ بلایا اور آستانۂ خلافت میں اس درویش عالم کی مہمان داری کا شرف بخشا۔ سلطان عبدالحمید نے مولینا سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ قسطنطنیہ میں قیام فرما ہوں جس کے جواب میں آپ نے فرمایا "اعزا و اقارب سے جُدائی اور وطن سے ہجرت اختیار کی خدا کی پناہ میں آیا اور آستانۂ نبوت پر سجدہ ریز ہوا اب اس کو چھوڑ کر اگر آستانۂ خلافت پر مرونگا تو خدا کو کیا مُنہ دکھاؤنگا۔"

مولنٰنا نے اپنے محب صادق حضرت مولینا امداد اللہ صاحب مہاجر مکی مدنی (رحمتہ اللہ علیہ) کے مشرب صلح کل کی روح کو اپناتے ہوئے اپنے مدرسہ کے نصاب کی ترتیب میں اپنی دینی بصیرت کا ثبوت دیا۔ اختلافی مسائل سے خود کو الگ رکھا اور اپنے اس مرکزی ادارہ کو عراق و عجم مصر و شام، حجاز و فلسطین اور ہند و ایران کے طلباء کے لیۓ ایک مشترک سرچشمۂ علم و عرفان بنانے کی سعی کی۔

مولینا نے مسیحی فتنۂ ارتداد کی رد میں اور دوسرے دینی مسائل و مباحث پر بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں ان میں ازالتہ الاوہام - ازالتہ الشکوک اظہار الحق اور اعجاز عیسوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شکوک وشبہات کو جس غیر تحقیقی اور غیر علمی انداز میں پیش کرنا شروع کیا اس نے کردار کشی کی شکل اختیار کرلی۔ یہ لوگ تاریخی حقائق کو جس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتے تھے اور سچائی سے قدم بقدم انحراف کو جس طرح اپنے لیے جائز سمجھتے تھے اس پر کوئی صاحب فکر وفہم عالم اور شفاف ذہن رکھنے والا انسان مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔

مولانا نے اپنی دینی بصیرت اور علمی تبحر کے سہارے ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ ملکر جس طرح اکبرآباد اور بعض دوسرے مقامات پر مسیحی مبلغین سے مناظرے کیے اور جس علمی سطح اور تحقیقی انداز نظر کے ساتھ اپنے حریفوں سے خطاب کیا۔ اس نے مذہبی بحث وتکرار کا رنگ بدل دیا اور اس کے وسیلہ سے ہماری زبان اور اس کے مذہبی لٹریچر میں علم وتحقیق کے بہت سے گوشے روشن ہوئے اور ارباب فکر ونظر کے لیے دید و دریافت کی نئی راہیں کھلیں۔

حضرت مولانا اور ان کے شریک سہیم ڈاکٹر وزیر خاں نے کتب مقدسہ یہود ونصاریٰ میں تنسیخ وتحریف کی بحث میں ترتیب مقدمات اور اخذ نتائج کے لیے سنجیدہ علمی حدود کی پابندی، شواہد ونظائر کے درجہ استناد، دلائل وبراہین کی قطعیت، تخمین وظن سے پرہیز، اصل ماخذ کی طرف رجوع لفظ ومعنی کے رشتہ، مخصوص مصطلحات کی معنیاتی حدبندی، حق پژوہی کے جذبہ اور علمی دیانت کے ساتھ سچائیوں کے اعتراف پر جس طرح اپنی تحریر وتقریر میں زور دیا ہے وہ اردو زبان کے تحقیقی کاموں کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

مولانا، پادری فنڈر اور دوسرے شرکاء بحث کے مابین جو خط وکتابت ہوئی ہے اگر اس کو احتیاط سے منضبط ومرتب کرلیا جائے تو اس سرمایہ کو اردو زبان میں علمی مکتوب نگاری کی طرف ایک بڑی پیش رفت قرار دیا جائے گا جس سے آج بھی استفادہ ممکن ہے۔

علمی مباحث کے بہ نظر غائر مطالعہ اور متون قدیم کی تقابلی مطالعہ کے ذریعہ تحقیقی وتاریخی تفہیم کی طرف توجہ بہت کچھ انہیں تحریروں کے وسیلہ سے منتقل ہوئی ہے۔

مناظروں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ سنہ ۱۸۵۷ کا ہنگامہ برپا ہوا جسے ہندوستان کی آزادی کا ایک سرجوش کہنا چاہئے مولانا جو انگریزی اقتدار کے سخت مخالف تھے اس جنگ میں مجاہدین کے ساتھ رہے اور پھر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ کے طریق ہجرت پر کاربند ہو کر حجاز مقدس چلے گئے وطن مالوف سے دائمی جدائی اختیار کی اور دیار حبیب کو اپنے سجدوں سے سجایا۔

حجاز مقدس میں رہتے ہوئے مولانا نے جو مستقل نوعیت کے کام کیے اور مسلمانان عالم کے لئے جو عظیم خدمات انجام دیں ان کا نشان ذی شان آج مدرسہ صولتیہ کی شکل میں موجود ہے جو سعودی عربیہ کی ایک قدیم تر دینی درسگاہ ہے اس مدرسہ کا قیام اور اس کی ابتدائی عمارت کی تعمیر کلکتہ کی ایک مخیر مسلمان خاتون صولت بیگم کی مالی امداد سے عمل میں آئی ہندوستانی معماروں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا اور اس کا تعمیری خاکہ بھی ہند اسلامی طرز تعمیر کے خطوط پر مرتب کیا گیا۔

مدرسہ کا قیام ۱۸۷۴ء میں عمل میں آیا یہی وہ زمانہ ہے جب مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی بنیاد

پاسبانِ حرمین

(حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی)

از جناب توصیف علوی صاحب عاصی بی۔ اے کیرانوی

آسمانِ علم و حکمت کا وہ اک ماہِ تمام
وہ کہ کیرانہ کی بستی سے تھا چمکا جس کا نور
وہ کہ جس کا فیض ہے ہندوستاں سے تا عرب
جو کہ تھا علم و معانی کا حقیقی راز داں
جو کہ اپنے دور کا عالم بھی تھا زاہد بھی تھا
جس کو فطرت نے دیا تھا وہ شعورِ زندگی
جو کہ تھا "ہادیِ نصاریٰ" جو کہ تھا حق کا ستون
جس کے دل میں موجزن تھا جذبۂ ایماں کا جوش
دینِ حق کا جو اٹھا تھا ہاتھ میں لیکر علم
جس نے توڑا تھا "مسیحی نظریہ" کے جال کو
جو کہ اپنے دور کا تھا صاحبِ سیف و قلم
جو "یقیں محکم" کے حسنِ فکر کی تنویر تھا
وہ کہ پہلی جنگِ آزادی کا سالارِ عظیم
وہ کہ آزادی کی منزل، کی تھی جس نے استوار
انقلاباتِ زمانہ کا وہ ایک تاریخ ساز

"رحمت اللہ" جس کی ذاتِ خاص نے پایا تھا نام
ہاں مگر پھیلی تھی جسکی تابناکی دور دور!
وہ کہ جو لیکر اٹھا تھا اک نئی جہدِ طلب!
نورِ ایمانی کا تھا جو ایک ماہِ ضوفشاں!
جو حقیقت میں مجاہد بھی تھا اور قائد بھی تھا
فکرِ انسانی کو بخشی جس نے اک تابندگی!
جس نے توڑا تھا فرنگی سحر کاری کا فسوں
دیکھ کر اڑتے تھے جس کو "پادری فنڈر" کے ہوش
دشمنانِ دین کے جس نے اکھاڑے تھے قدم
جس نے ناکارہ بنایا تھا فرنگی چال کو!!
سرنگوں جس نے کیئے فکرِ نصاریٰ کے علم!
درحقیقت جو "عمل پیہم" کی ایک تصویر تھا
حریت کے باب کا وہ ایک کردارِ عظیم!
وہ کہ تھا فکر و نظر کا ایک نرالا شاہکار
وہ عرب کا فخر، وہ ہندوستاں کا وجہِ ناز

جس کی ہستی درحقیقت پاسبانِ حرمین ہے!
زندگی جس کی جہاں میں مشعلِ دارین ہے

ـــــ ⁂ ـــــ

بیاد مولانا رحمت اللہ کیرانوی

از جناب جبہ آر چھولسی

آج بھی مدرسۂ صولتیہ سے ہیں عیاں
تیری عظمت کے منارے تیری ہیبت کے نشاں

درجۂ سحر کہاں، پایۂ اعجاز کہاں
گنگ سب ہو گئے تو جبکہ ہوا رطب لساں

آج بھی ہے وہ زمین سجدہ گہہِ عزم جواں
تو نے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا تھا جہاں

قصرِ تثلیث کی بنیادیں ہلانے والے
تیری ہمت تری جرأت پہ ہے دنیا حیراں

کیا ٹھہرتا تیرے آگے کوئی ایماں کا حریف
پیش خورشید کے جرات خفاش کہاں

کفر والحاد نے پھر سر کو اٹھا رکھا ہے
رحمت اللہ تجھے ڈھونڈھتے ہیں اہل جہاں

تیرا اقدام تری غیرتِ قومی کا ثبوت
تیری بخشش، ترے خطبات دلیلِ عرفاں

دین کی خدمتِ بے لوث رہا تیرا شعار
دل میں پیدا نہ ہوا وسوسۂ سود و زیاں

وہ تری منزلت و قدر کو کیا سمجھیں گے
جنکے دل، جنکی جبیں پیشِ جہاں سجدہ کناں

قطعہ

رات دن آندھیاں تثلیث کی چلتی ہی رہیں
کفر والحاد کے اٹھتے رہے کیا کیا طوفاں

تو جلاتا ہی رہا مشعلِ ادراک و یقیں
تو سنبھالے ہی رہا کشتیٔ دین و ایماں

قوم کو مسندِ عزت پہ بٹھایا تو نے
ہائے اس دور میں اب تجھ سے حق آگاہ کہاں

تو مجاہد تو معلم تو مبصر تو حکیم!
کیا لکھے وصف یہ جبرآر سا آشفتہ بیاں

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی مکّی زندگی

محترمی نسیم اختر شاہ قیصر، ایڈیٹر اخبار حق دیوبند

قدرت نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو غیر معمولی بصیرت اور تدبر و فکر سے نوازا تھا۔ انکے اندر ایک عظیم فعال اور انقلابی روح تھی۔ جس کی بدولت انھوں نے برسوں قلم و لسان اور سیف و سناں سے عیسائیت کا مقابلہ کیا۔ اور ہندوستان میں حریِن اسلام کو سربلند رکھنے کی بے انتہا جدوجہد کی۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں جب انگریزوں نے سلطنت مغلیہ پر قبضہ کیا تو یہ سوچ کر کہ عیسائیت اپنی مادی فتح مندیوں جب تک مسلمانوں کے قلوب کو فتح نہ کریگی۔ اس وقت تک اس ملک میں اس کو استقرار و استحکام حاصل نہ ہوگا۔ انہوں نے عیسائی مبلغوں کی مختلف جماعتوں کو ہندوستان کے طول و عرض پر پھیلا دیا۔ جنھوں نے انتہائی چابکدستی سے عیسائیت کی تبلیغ و ترویج اور تثلیث کے پروپیگنڈے کے ساتھ اسلام پر اعتراضات کرنا شروع کئے اور شہروں، بستیوں، محلوں اور کوچوں میں گھوم گھوم کر تحریر و تقریر کے ذریعہ اس کی اشاعت کی اور عوام و خواص کے قلوب کو متنفر کرنا شروع کیا

یہ وقت بڑا نازک، صبر آزما اور حوصلہ شکن تھا۔ جب تثلیث مادی و معنوی دونوں طریقوں سے اسلام کی بڑ جڑوں پر دھاوا بول رہا تھا اور اسلام کے اس غریب مسافر کو ہر طرف سے ختم کرنے کی کوشش کی جارہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا اب پورا ہندوستان کفر و تثلیث کا مرکز بن جائے گا اور کوئی وحدہ لاشریک کا اب نام لیوا باقی نہ رہیگا لیکن اسلام جو ساری دنیا کے لئے شمع بن کر آیا تھا اور جس نے ہندوستان کے شہروں و قصبوں اور آبادیوں ویرانوں میں توحید کی روشنی کی تو کیسے ممکن تھا کہ اس ملک سے رخصت ہوجاتا۔ چنانچہ اس نازک ترین وقت میں ایسے ربانی علماء کھڑے ہوئے جنھوں نے اسلام کے نورِ جہانتاب کو کفر و شرک کے گرد و غبار سے پاک رکھنے کی کوشش کی اور اپنی عالمانہ فکر و نظر اور مجتہدانہ بصیرت سے عیسائیت کا مقابلہ کیا۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ان علمائے کرام میں تھے۔ جنھوں نے عیسائیت کی تردید میں قائدانہ رول ادا کیا اور اب بلا خوف و ہراس انجیل میں تحریفِ لفظی ثابت کی اور عیسائی مبلغین کے عائد کردہ سوالات و اعتراضات کا برجستہ محققانہ جواب دیا اور قلمی معرکہ کے بعد جب ۱۸۵۷ء کا نعرۂ جہاد بلند ہوا تو معرکۂ دہلی

اور معرکۂ کیرانہ میں حصہ لیا۔

لیکن جب ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ تو انھوں نے علماء و فضلاء پر مظا[لم]
اور ان کی گرفتاریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ ہزاروں علماء تہہ تیغ کر دیے گئے اور سینکڑوں کو گرف[تار]
کر کے انڈمان وغیرہ میں بھیج دیا گیا، اور جو باقی بچے وہ چھپ کر اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر ہندوستان سے ہجرت
کر کے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ ان ہجرت کرنے والوں میں حضرت مولانا بھی تھے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ان ابطال اسلام میں تھے۔ جنھوں نے قلمی و معنوی اور فکری و لسانی
میدان میں حیرت انگیز فتح پائی۔ جس کے نتیجہ میں وہ لوگ جنھوں نے میدانِ جنگ کی مادی فتح کے ذریعہ مسلمانو[ں]
کی گردنوں کو سرنگوں کر دیا تھا، آخر تک ان کے قلوب و اذہان پر فتح نہ پا سکے اور حضرت مولانا اس علمی
فتح کے بعد حجازِ مقدس چلے گئے۔ جہاں ان کے ہم نوا و مشیر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی پہلے
ہی پہنچ چکے تھے اور "رباط داؤدیہ" میں مقیم تھے۔ مولانا جب پہنچے تو انھیں کے ساتھ "رباطِ داؤدیہ" میں ہی
قیام کیا۔

یہ سلطان عبد العزیز خاں (سلطانِ ٹرکی) کی خلافت کا زمانہ تھا اور اس وقت مکہ کے امیر شریف عبد اللہ بن عون محمد
تھے۔ خلافت کی طرف سے مسجد حرام میں علماء فقہاء کے درس کا انتظام تھا۔ جو الگ الگ زاویوں اور حلقوں میں قرآن و
حدیث اور فقہ و علم کلام کا درس دیتے تھے۔ اس وقت شیخِ حرم سید احمد دحلان تھے۔ جن کا درس سب سے
زیادہ مشہور تھا۔ حضرت مولانا کا مزاج چونکہ علمی و فکری تھا۔ اس لئے طواف و نوافل سے فراغت کے بعد
سید صاحب کے درس میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ سید احمد دحلان شافعی المسلک تھے۔ ایک دن درس میں کسی
مسئلہ میں شوافع کی حمایت کی اور احناف کے دلائل کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مولانا رحمت اللہ صاحب چونکہ
حنفی المسلک تھے اور اس مسئلہ میں احناف کے دلائل کو قوی خیال کرتے تھے۔ اس لئے درس کے بعد ان سے ایک
طالبِ علم کی حیثیت سے ملاقات کر کے مسئلہ میں تشفی چاہی۔ کچھ دیر کی بحث اور ردّ و قدح کے بعد سید صاحب نے آپکی
علمیت و تفقہ کا اندازہ لگا کر آپ کے حالات جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ اور دوسرے دن گھر پر کھانے کو بلایا۔ گفتگو
میں غالباً حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا بھی تذکرہ آیا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن حاجی صاحب کے ساتھ سید صاحب کے
یہاں پہنچے اور کھانے میں شرکت کی اور سید صاحب کے استفسار پر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و سماجی اور اقتصادی
حالات کے بیان کے ساتھ عیسائیوں سے ہونے والے اپنے مناظروں کا بھی تذکرہ کیا۔ شیخِ حرم نے ان تمام واقعات
کو سنکر آپ سے کافی اچھا اثر لیا اور حرم کے مدرسین میں آپ کا نام بھی درج کر لیا۔

مولانا نے ہندوستان میں تقریباً سات برس تک عیسائی مبلغین کا قلمی و لسانی طور پر مقابلہ کیا تھا۔ اور
ہر جگہ ان کو شکست دی تھی۔ اس وقت خلافت ترکی اور انگریزوں کے تعلقات بہت خوش گوار تھے۔ اس لئے سنہ میں
جب پادری فنڈر جسے آپ نے سنہ کے آگرہ کے مناظرہ میں شکست دی تھی، ٹرکی پہنچا تو سلطان عبد العزیز کی خدمت

میں حاضر ہو کر یہ بیان کیا کہ میرا ہندوستانی علماء سے مناظرہ ہوا تھا اور ان مناظروں میں عیسائیت کو فتح حاصل ہوئی ہے اور ہزاروں مسلمان عیسائیت قبول کر رہے ہیں۔ سلطان یہ سنکر فکرمند ہوا اور امیرِ مکہ کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ موسمِ حج میں ہندوستان سے آئے ہوئے علماء سے حقیقتِ حال معلوم کی جائے۔ جب یہ فرمان پہنچا تو مولٰنا مکہ ہی میں تھے۔ اور وہاں کے علمی حلقوں میں آپ کے ردِ عیسائیت کے کارناموں کی کسی قدر شہرت ہو چکی تھی۔ اس لئے امیرِ مکہ نے حالات لکھ کر دربارِ خلافت میں بھیج دیا۔ جس کے بعد مرکز سے مولٰنا کی حضوری کے بارے میں دوبارہ فرمان آیا، اور سنہ ۱۸۶۴ء میں آپ خاص اعزاز و اکرام کے ساتھ شاہی مہمان کی حیثیت سے استنبول پہنچے، اور سلطان نے آپکو باریابی بخشی اور آپ کے مناظروں کے حالات سنکر دلچسپی اور مسرت ظاہر کی۔ اور خلعتِ فاخرہ کے ساتھ تمغۂ مجیدی اور ، گرانقدر وظیفہ سے سرفراز کیا۔ لیکن جس مقصد کی خاطر وہاں گئے تھے وہ پورا نہ ہوا۔ اور پادری فنڈر نے آپ کی آمد کی اطلاع پاکر قسطنطنیہ چھوڑ کر انگلستان چلا گیا اور دوبارہ مناظرہ نہ ہو سکا۔

اس ملاقات میں مولٰنا نے سلطان کو بہت قیمتی مشورے دئے۔ خصوصاً عالمِ اسلام کو عیسائیت کے خطرات سے آگاہ کیا۔ جس کا سلطان پر اچھا اثر پڑا اور ایک فرمان کے ذریعہ اُن ترکی عیسائی مبلغین کو قید کرنے کا حکم دیا، جو عین مرکزِ خلافت میں اسلام کے خلاف تقریریں کرتے تھے اور عیسائی کتابوں کو برملا فروخت کرتے تھے۔ عیسائیت کے خطرات کی طرف سلطان کی توجہ منعطف کرانے کا نتیجہ اچھا پیدا ہوا۔ اور سلطان نے عربی میں ردِ عیسائیت پر ایک کتاب لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جسے آپ نے "اظہار الحق" کے نام سے مرتب کیا اور سلطان نے اس کتاب کو شائع کرایا۔

لیکن مولٰنا نے مشوروں کے علاوہ ملکی زندگی میں سیاست و معیشت میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور اپنے آپ کو عملی سیاست سے الگ رکھا۔ حتیٰ کہ جب آپ تیسری بار قسطنطنیہ گئے اور سلطان نے مرکزِ خلافت میں رہنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے رد کر دیا اور اپنی زہد و ورع کی زندگی کو پسند کیا۔ جس کے نتیجہ میں ان کی وہ برق رفتاری جو ہندوستان میں سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد شروع ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۸۲ء کے بعد بالکل سُست پڑ گئی اور یہی حالت سنہ ۱۸۸۶ء تک پڑی رہی۔ مگر اس عملی سیاست کے باوجود انھوں نے اپنے جن سیاسی و اقتصادی نظریات سے سلطنت کو آگاہ کیا وہ بڑے وقیع اور قیمتی ہیں۔ چنانچہ "مکہ" سے وہ ایک خط بھی جسے "وزیرِ اعظم ٹرکی" کو لکھا ہے اس میں عالمِ اسلام کی معاشی و اقتصادی زبوں حالی کی دو وجہیں بیان کی ہے (۱) ایک عالمِ اسلام عمومی جہالت اور (۲) دوسرے ارکانِ دولت اور عمائدینِ سلطنت کی عدم توجہ، عالمِ اسلام کی علمی و سیاسی پستی اور تنزلی کا ان کو شدید احساس تھا۔ اور اس احساس نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی۔ کہ ان کو سارا عالمِ اسلام جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کو صنعت اور ٹیکنیکل کی لائن میں پیچھے رہنے کا شدید احساس تھا۔ اس خط میں وہ وزیر اعظم کو لکھتے ہیں۔

"ششم آنکہ در بر و صحاری در عمارت اراضی صالحہ زراعت و اندروں آبادی بلاد بترویج صنائع

وفنون می کوشند بعدش بتدریج در خراج آمدنی ہر دو شباً فشباً می افزائید، و امرائے دولت از ہر دو عموماً و در اول خصوصاً غفلت می کنند، و گر ملک دولت علیہ ادا مہا اللہ رب البریہ دریں وقت ہم زائد از ملک فرانسہ است، بس کسے با انصاف مراں ہر دو ملک را بہند و صنائع فنون ہر دو جا را ملاحظہ می کند۔"

اسی طرح مدینہ، عراق اور سوڈان کی زرعی امور کی طرف تفصیلی توجہ دلائی گئی ہے اور معدنیات و پوشیدہ خزائن مثلاً کوئلہ وغیرہ نکالنے کی طرف دھیان منعطف کیا ہے۔ یہ خط بڑا مفصل وقیع اور قیمتی ہے جو اُن کی سیاسی امور میں عمق و گہرائی کو اُجاگر کرتا ہے۔

حضرت مولانا کو عالم اسلام کی علمی بے مائیگی کا شدید احساس تھا۔ خاص طور پر جب وہ دیکھتے کہ مکہ معظمہ جو علم کا سرچشمہ تھا اور جہاں سے معرفت کی کرن پھوٹی تھی۔ خاص اس مقام پر جہالت کی تاریکیاں پھیلتی جارہی ہیں، اور مرکز خلافت کی توجہ کے باوجود ابتک یہاں اکوئی ایسا دارالعلوم قائم نہ ہو سکا جہاں باضابطہ طلباء و اساتذہ قیام پذیر ہوں اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہو۔ اس زمانہ میں اگرچہ مسجد حرام میں مختلف علماء کے درس ہوا کرتے تھے۔ جس کی سرپرستی خلافت عثمانیہ پوری توجہ کے ساتھ کرتی تھی اور اُس پر زر کثیر خرچ کرتی تھی۔ مگر وہ درس کے حلقے کسی نظام اور ضابطے کے ماتحت نہ تھے۔ نظام تعلیمی نہایت ناقص تھا۔ یہانتک کہ کوئی نصاب درس بھی مقرر نہ تھا۔ دوسرے تدریس کا طریقہ ایسا تھا کہ درس میں شریک ہونے والے طلباء نے ایک وعظ و تقریر کی طرح اس سے مستفید ہوتے تھے۔ طلباء میں ذاتی استعداد اور قوت مطالعہ پیدا ہوتی تھی اور نہ نگاہ بصیرت نکلتی تھی۔ ان میں علم و تحقیق کا کوئی ذوق پیدا نہ ہوتا تھا۔ سات آٹھ سال مسلسل نحو، فقہ، تفسیر اور حدیث پڑھنے کے باوجود واقفیت پیدا نہ ہوتی تھی۔ اس کے خاص طور پر مدرسہ کی عدم موجودگی ان مہاجرین کی اولاد کے لئے ضروری تھی جو اس مقدس سرزمین پر آکر قیام پذیر ہوتے تھے۔ مگر عبادت کے ساتھ انکی دین کے سیکھنے کا کوئی خاص انتظام نہ پاکر بے کار ہوتی جارہی تھی۔ اس لئے مولانا نے مکہ کے ہندوستانی مہاجرین اور اہل خیر اصحاب کو اس طرف متوجہ کیا اور رمضان سنہ ۱۲۹۰ھ میں نواب فیض احمد خاں صاحب مرحوم رئیس جو ضلع علیگڑھ کے رہائشی مکان کے ایک حصہ میں مدرسہ کی ابتداء کی۔ پھر سنہ ۱۲۹۱ھ کے موسم حج میں کلکتہ کی ایک فیاض خاتون "صولۃ النساء" صاحبہ حج کرنے آئیں تو مولانا کے مشورہ سے انھوں نے محلہ "خندریسہ" میں ایک جگہ خریدی اور اس پر مدرسہ کی تعمیر اپنی نگرانی میں کرائی۔ قیام کے بعد بعض مقامی ترکی حکام سے اس میں کچھ مشکلات بھی پیش آئیں، اور انھوں نے ایک غیر ملکی مفکر کے ہاتھوں اس کی بنیاد کو پسند نہ کیا۔ چنانچہ اس بناء پر جب یہ معاملہ مرکز خلافت یعنی "قسطنطنیہ" تک پہنچا تو سلطان نے دوبارہ سنہ ۱۲۹۹ھ میں آپ کو طلب فرمایا اور مدرسہ کی بنیاد اور اس کی اہمیت و ضرورت کو آپ کی زبانی سنکر مسرت کا اظہار کیا اور امداد کی پیش کش کی۔ مگر آپ نے اس کو قبول نہ کیا، اور یہ فرمایا کہ :۔

"حرمین شریفین میں امیر المومنین کے بہت سے جاری کردہ امور خیر ہیں اور بہت سے نیک کام تشنۂ تکمیل، مدرسہ صولتیہ چونکہ ہندوستان کے دین دار اور نیک خیال مسلمانوں کی امداد سے چل رہا ہے اور قائم ہے ان کو اس کارِ خیر میں شرکت اور سرپرستی کی سعادت سے محروم نہ فرمایا جائے۔ جو یقیناً امیر المومنین کے انصافِ شاہانہ سے بعید نہیں۔"

حضرت مولنٰنا کو صنعت و دستکاری میں مسلمانوں کی پستی کا احساس تھا۔ جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے ایک خط میں وزیر اعظم کے نام کیا ہے۔ اس احساس کے تحت انھوں نے دینی علوم کی تدریس کے ساتھ ایک صنعتی اسکول بھی قائم فرمایا۔ جس میں باضابطہ صنعت و دستکاری کی تعلیم دی جاتی تھی۔

حضرت مولنٰنا نے ملکی زندگی میں عملی سیاست سے اپنے آپ کو بالکل علیحدہ رکھا تھا۔ اس لئے مدرسہ کے نظم و نسق میں بھی اس کا خیال رکھا کہ سیاسی دلچسپیوں سے اس کو علیحدہ رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ اپنی تجویز سیاسی امور سے بالکلیہ احتراز اور اختلافیات سے پرہیز کو لازم قرار دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک یہ مدرسہ صحیح و خوبی سے ایک غیر ملک میں چل رہا ہے اور اس کی کرنوں سے سارا حجاز منور ہو رہا ہے۔

ہورہی ہیں۔ قلوب میں ایمان تازہ ہوتا ہے ۔ اپنے عظیم بزرگوں سے روحانی وتاریخی تعلق مستحکم ہورہا ہے۔ رحمتِ خداوندی نے اپنے دینِ متین کی حفاظت کے لئے از نفوسِ قدسیہ کا انتخاب کیا۔ رحمۃ للعالمین کی نیابت کا فخر ان کو حاصل ہوا۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں میں جب تک اپنی تاریخ اور اپنے عظیم بزرگوں کے کارناموں کے احیاء کا جذبہ باقی ہے۔ انشاء اللہ اُمت کے بقاء اور پھلنے پھولنے کا امکان بھی باقی ہے۔

ایک وہ وقت تھا جبکہ اسی دہلی کی سرزمین پر مسلمانوں کے اقتدار کا آفتاب غروب ہورہا تھا۔ سامنے لال قلعہ جو صدیوں تک ہماری عظمتوں کا امین رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پتھروں کی سرخی اس کی اپنی سرخی نہیں رہی۔ بلکہ ہمارے بزرگوں اور اہلِ وطن کے خون کی سرخی اس کے پتھروں میں منتقل ہوگئی ہے۔ لال قلعہ اسمِ بامسمّٰی بنکر تباہی و بربادی کے المیہ میں شریکِ حال ہونے کو سُرخ ہوگیا ہے۔ کمپنی بہادر کے فرزند سوداگری کا لبادہ اتار کر سیاہ و سفید کا مالک بنکر اہلِ ہند کی قسمتوں کا فیصلہ کر رہے تھے۔ یہی جمنا ہے۔ جس کے کنارے ہمارے بزرگوں علماء مشائخ اور عام مسلمانوں کو تختہ دار پر لٹکایا جارہا تھا اور انکا خون جمنا کی ریت اور جمنا کے پانی میں مل کر ایسی روشنائی بن رہا تھا جس سے لکھی جانے والی تاریخ مستقبل میں حقیقی عظمتوں کا ترجمان، ایمان کی سربلندیوں کی امین اور نتائج کے اعتبار سے ہمہ گیر اہمیتوں کی حامل ہوگی اور مسلمانوں کو رہتی دنیا تک انقلاب اور اسلام کے لئے جان دینے کی دعوت دیتی رہیگی۔ ۱۸۵۷ء میں فرنگی کا جاہ وجلال اپنے عروج پر تھا۔ اس کے سر پر اسلام اور مسلمانوں سے نسبت رکھنے والے ہر وجود کو ختم کرنے کا بھوت سوار تھا اپنی حکومت کے استحکام کے لئے بڑے بڑے خوفناک اقدام کے لئے وہ تیار تھا۔ بابر کی فتوحات ہمایوں کی طالع آزمائیاں، اکبر کی ہمہ گیریاں، جہانگیر کی عدل آرائیاں، شاہجہاں کی شاہ جہانیاں اور عالمگیر کی عظمت وجلال فرمائیاں عالمِ اقتدار سے اپنی بساطِ زندگی کو سمیٹ کر تاریخ کے صفحات میں پناہ لے رہی تھیں۔ بساط الٹ چکی تھی۔ نیا حاکم اپنی حکومتی طاقت واقتدار کے ساتھ اپنے مذہب کی اشاعت اور اس کو مغلوب ملک اور قوم پر مسلط کرنے کے لئے ہر سنگین اقدام کے لئے تیار تھا۔ اقتدار اور حکومت کی لائن سے اس کا مقابلہ چونکہ مسلمانوں سے تھا اور ہمارے حسّاس اور جانباز علماء اور امراء و حکام روزِ اول ہی سے خطرہ کی بو سونگھ کر سینہ سپر ہو گئے تھے۔ جگہ جگہ تیغ وسناں کے میدانِ کارزار گرم تھے۔ حکومتی اقتدار و تسلط کے ساتھ برطانیہ سے عیسائی مشنری اور مذہبی جماعتوں کی بہت بڑی تعداد اس تیاری اور عزم کے ساتھ یہاں لائی گئی تھی کہ حکومتی تسلط کے شانہ بشانہ تبلیغِ عیسائیت کا کام بھی زور وشور کے ساتھ جاری رہے اور ایک مغلوب قوم اور ملک کو اس کے اقتدار سے محروم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دین ومذہب پر بھی ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ عیسائی مذہب وملت اور نصرانی تسلط کے سامنے کوئی بھی دوسرا مذہب یا عقیدہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ یہ خطرناک صورتِ حال ہمیں انقلاب ۱۸۵۷ء کے تذکروں تصانیف اور حالات میں شرح وبسط کے ساتھ ملتی ہے اور ہماری برِصغیر کی ایک سو سالہ تاریخ کا بھی سنگِ بنیاد اور خشتِ اول ہے۔ اجنبی غاصب اور فرنگی حاکم کی پشت پناہی کے بل بوتے پر عیسائی مبلغین کی چیرہ دستیوں اور

شور شوں کا سلسلہ گرم اور دراز ہوتا جارہا تھا۔ انکی جماعتیں مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رہنے دیتیں۔ حساس ذہن رکھنے والے مسلمانوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ مگر حالات کے سامنے لاچار و بے بس تھے۔ اور علماء کے پاس ردِ عیسائیت اور پادریوں سے دلائل و براہین کے میدان میں دو دو ہاتھ کرنے کے لئے علمی و تحقیقی سرمایہ نہ تھا۔

اس مضمون کے ذریعہ مجھے حالات کا جائزہ لینا نہیں بلکہ اس دور کے جلیل القدر اور عظیم المرتبت علمائے دین اور مجاہدینِ عظام کی قابلِ احترام بابرکت فہرست میں جس شخصیت کا نام سرِ فہرست ہے اور اس پوری صدی کے تمام تاریخی مواد میں ہر جگہ نہایت اہمیت و عظمت اور اعترافِ حقیقت کے ساتھ انکا نام لیا جاتا رہا ہے اور جن کو عیسائیت کے ساتھ علمی و تحقیقی جنگ میں سب اہلِ علم اور اربابِ تصنیف و تالیف اور جماعتِ علمائے امام المناظرین اور فاتحِ نصرانیت تسلیم کیا ہے۔ وہ حضرتِ اقدس مولانا محمد رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی ہے۔ جو اس خطرناک زمانہ میں عیسائی مشنریوں کے سر پر شمشیر بنکر چمکی۔ اسلام کے تحفظ کی خاطر فرنگیوں کے مقابلہ میں سینہ سپر رہی۔ ابطال تثلیث اور نصرانیت کی سرکوبی کے لئے تقریباً دس ضخیم و بے مثال کتابیں اردو، فارسی، عربی میں تصنیف کیں۔ رب العزت کی تائید و نصرت کے زیر سایہ ایمانی عزم و ہمت کے ساتھ اکبر آباد (آگرہ) میں عیسائیت کے سب سے بڑے علمبردار اور پورے ہندوستان میں مسیحی جماعتوں اور مشن کے سربراہ اور فتنہ مجسم پادری فنڈر اور اس کی جماعت سے مناظرہ کے میدان میں مقابلہ کر کے اور اس کو اور اس کی جماعتوں کو شکستِ فاش دی کہ تیسرے دن مناظرہ کی فیصلہ کن مجلس میں حاضر ہونے کے بجائے گزشتہ دو روز کی ہزیمت و مغلوبیت کے شب کی تاریکی میں فرار ہونے اپنی عزت بچانے ہی میں خیر سمجھی۔ جس کے بعد اجتماعی طور پر علی الاعلان پادریوں کو مسلمان علماء کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چنانچہ مناظرہ کے بعد تمام مسلمانوں اور علمائے کرام میں بھی اپنے دین کا دفاع کا تصور بیدار ہوا۔ جگہ جگہ جہادی تنظیمیں اور دینی لائن سے دفاعی صورت حال وجود میں آنا شروع ہوگئیں۔ علمائے اسلام نے عیسائی لٹریچر کا مطالعہ شروع کیا۔ اس وقت پورے ہندوستان میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب ہی کی ذاتِ گرامی تھی جو مرجع تھی۔

اس مضمون کے ذریعہ حضرت مولانا رحمت اللہ کی عظیم شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور انفرادی حیثیتوں سے موجودہ دور کے مسلمانوں اور نوجوانوں کو متعارف کرانا ہے۔ تمام بزرگانِ دین کے حالات میں جو خاص چیز قدرِ مشترک ہے وہ انکا خلوص، للّہیت اور زہد فی الدنیا اور اپنے دین کے بقا و احیاء کے لئے فنائیت ہے۔ اکابر امت اور بزرگانِ دین میں اس قدرِ مشترک کے علاوہ ہر ایک کا اپنا علیحدہ مقام رہا ہے۔ اس زمانہ کے حالات و واقعات اور ضرورت کے مطابق مشیت الہٰی نے اس کے لئے جو راہ متعین فرمادی۔ اس میں وہ اپنی جگہ چاند اور سورج بنکر چمکا اور انکا فیض جاری و ساری رہا۔

اس قاعدہ کلیہ کو سامنے رکھتے ہوئے زیر بحث و تعارف ہستی حضرت مولٰنا رحمت اللہ صاحب کی
کو اگر دیکھا جائے تو ہمیں متعدد پہلو نظر آئیں گے کہ رب العزت نے ان کو بیک وقت پوری زندگی میں کن کن
اور مقاصد کے لئے قبول فرمایا اور انھوں نے باری تعالیٰ کی تائید و توفیق کے ساتھ اسلام کی سربلندی
کی فلاح و بہبود، دینِ متین کی خدمت، علومِ محمدیہ کی اشاعت، جہاد فی سبیل اللہ اور توحید و
کی حفاظت و پاسبانی اور عقائدِ اسلام کے احیاء کے لئے کیا کارہائے نمایاں انجام دئے۔ یہ مختصر مضمو
انھیں پہلوؤں کا تعارف ہے، مفصل تاریخی تذکرہ نہیں۔

علمائے ہند کی درخشاں تاریخ اور نورانی فہرست میں اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ اپنے اپنے مید
عمل و خدمت میں نامور و عظیم علماء کے تذکروں اور وجود سے کہکشانِ عظمت کی شاہراہ جگمگا رہی ہے۔ مگ
رحمتِ باری کی جانب سے حضرت مولٰنا رحمت اللہ صاحب کو جو مایہ الامتیاز انفرادیت عطا ہوئی اور
شخصیت اور ہستی میں جو خصوصیات اور متعدد پہلو قدرت نے ودیعت فرمائے وہ انکو یکتائے زمانہ کہلانے کے لئے کافی ہیں

۱۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں اسلام کے تحفظ و بقاء دینِ محمدی کے دفاع کے میدان میں انکی خدمات کا اج
تذکرہ آچکا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے میدانِ مناظرہ میں آپ سے مسیحی جماعتوں کی شکست و ریخت کا کام لی
جس کے بعد ۲۔ صرف مولٰنا ہی ہیں جو ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ نام بدل کر دو سال تک صحراؤں اور جنگلوں میں
گزار کر ۶ ماہ کا بحری سفر طے کر کے ربِ کعبہ کی پناہ میں مکہ معظمہ پہنچے۔ مکہ معظمہ پہنچنا تھا کہ رحمتِ خداوندی
کے دروازے کھلے اور آپ کے لئے خدمت دین کے ایسے اسباب پیدا ہوئے۔ جو سراسر اعزاز و تکریم کی لائن سے تع
۳۔ مکہ معظمہ کے شیخ الاسلام اور شیخ العلماء کی جانب سے صحن حرم میں درس و تدریس کا جو اعزاز بخشا گ
وہ بحیثیت ایک ہندی عالم کے سب سے پہلے آپکے لئے تھا۔

۴۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے مظالم کی خبریں ترکی پہنچیں اور حکومتِ برطانیہ نے پادری فنڈر کو ترک
میں دینِ مسیحی کی تبلیغی خدمت پر مامور کر کے بھیجا۔ پادری فنڈر نے ترکی میں جو زہر افشانیاں شروع کیں او
مسلمانانِ ہند کے خلاف غلط افواہیں پھیلائیں تو سلطان عبد العزیز بے قرار ہو گئے اور فوراً گورنر مکہ اور شیخِ حرم کے
ذریعہ حضرت مولٰنا رحمت اللہ صاحب کو بحیثیت سرکاری مہمان ترکی طلب فرمایا۔ آپ کے ترکی پہنچتے ہی پادری فنڈر
نے بھی نہایت خاموشی کے ساتھ راہ فرار اختیار کی۔ جس سے از خود سلطانِ معظم کو حالات کا اندازہ ہو گیا۔ سلطان نے کمال
التفات و مراحم خسروانہ سے حضرت مولٰنا کا اعزاز و اکرام فرمایا۔ چھ ماہ تک شاہی مہمان صرف اس لئے رکھا کہ اسلام
اور عیسائیت کے درمیان مختلف فیہ مسائل پر ایک جامع کتاب تصنیف فرمائیں اور ترکی میں عیسائی مشنریوں کے زہریلے
پروپیگنڈے اور پادریوں کی منہ شگافیوں اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کی روک تھام میں رہنمائی و تعاون کریں۔

چنانچہ حضرت مولٰنا نے ترکی کے ششماہی قیام میں اپنی بے مثال کتاب اظہار الحق تصنیف فرمائی۔ دقت فکر
اور استحضارِ علم کی یہ نادر مثال ہے کہ پانچ ماہ کے اندر حضرت مولٰنا نے ردِ عیسائیت میں اس قدر عظیم کتاب تالیف

فرمائی۔ جس کا جواب آج تک مسیحی دنیا نہ دے سکی اور جو اثبات توحید و رسالت میں سنگِ میل کا حکم رکھتی ہے۔ اور بلادِ اسلامیہ عربیہ میں اس سو سال کے عرصہ میں تمام علماء اور اہل فکر کا مستند ماخذ و مرجع رہی ہے۔ اظہار الحق کے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، ترکی اور اردو زبانوں میں تراجم ہوئے۔ اردو میں اس کا تازہ ترین ترجمہ "بائبل سے قرآن تک" کے نام سے دو ۲ ضخیم جلدوں میں دس سال قبل حضرت علامہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ بانی دار العلوم کراچی کی زیر پرستی مولانا اکبر علی صاحب مرحوم اور فاضل جلیل مولانا محمد تقی صاحب عثمانی نے کیا۔ یہ ترجمہ قادیانیت اور عیسائیت کے مقابلہ میں کام کرنے والوں کے لئے ایک مستند ہتھیار ہے۔ جس کو رب العزت نے بےحد مقبولیت عطا فرمائی۔

موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ ہمارے علمائے کرام اہل مدارس اور رجال فکر و قلم کی مساعئ جمیلہ کو قبول فرمائے اور ان کی عمر و عزائم میں برکت عطا کرے کہ ایک صدی گزرنے کے بعد وہ اسلام کے دفاع، عقیدہ کے تحفظ اور رسالت و نبوت کے پاکیزہ پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے اظہار الحق کو ہی بنیادی ماخذ و مرجع تسلیم کر رہے ہیں۔ بلاد عربیہ کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تقابلِ ادیان اصول الدین اور شریعت اسلامیہ سے متعلق مضامین میں "اظہار الحق" کا مطالعہ لازمی قرار دیدیا گیا ہے۔ ریاض میں جامعۃ الامام محمد ابنِ سعود الکبیر میں ایک فاضل مصری پروفیسر علامہ ڈاکٹر احمد حجازی پانچ ہزار ریال ماہانہ مشاہرہ پر اظہار الحق کا درس دے رہے ہیں اور یہ بے مثال کتاب داخلِ نصاب ہے۔

چند سال قبل حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لائے۔ مولانا کا علمی و تحقیقی مقام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مولانا مرحوم نے متعدد بار حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے علمی مقام اور تصانیف کے متعلق گفتگو فرماتے ہوئے حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کے یہ ملفوظات نقل فرمائے کہ توحید و رسالت کو جس بالغ نظری اور دقت فکر کے ساتھ مولانا رحمت اللہ صاحب ثابت کر گئے ہیں اور اس سے متعلق جس قدر دلائل وہ جمع کر گئے ہیں وہ لایاتی الزمان بمثلہ کا مصداق ہیں۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ قادیانیت کے مقابلہ میں جب علامہ کشمیری میدان میں آئے تو آپ کے مطالعہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی تصانیف اظہار الحق، ازالۃ الاوہام، ازالۃ الشکوک اور اعجازِ عیسوی کثرت سے رہا کرتی تھیں ان کتابوں کا مطالعہ بہت اہتمام سے فرماتے اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے لئے دعائے خیر ان الفاظ میں فرماتے کہ "اللہ مولوی رحمت اللہ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ ان کی کتابیں عقائدِ اسلامیہ کے تحفظ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ خدا نخواستہ وقت پڑنے پر ہمارے علماء کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

غلام احمد قادیانی کے بعض افترات کے جواب میں ایک دفعہ نہایت جوش کے ساتھ والہانہ انداز میں فرمایا کہ

مجھے تو یقین ہو چلا ہے کہ "مولوی رحمت اللہ کی کتابیں الہامی ہیں۔"

مولانا ادریس صاحب نے مزید فرمایا کہ ردِ عیسائیت کے موضوع پر سب سے پہلے علامہ ابن تیمیہ نے ابتدا کی۔

مگر ۱۸۵۷ء تک ان کی تصانیف کم از کم برصغیر میں غیر معروف اور غیر مطبوعہ تھیں - ہند کے کتب خانے ان سے یکسر خالی تھے - اور اب بھی ان کا کوئی خاص تعارف نہیں - اس موضوع پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی تحقیق اور محنت سے جو مواد فراہم کیا اور ضخیم کتب اور متعدد رسائل تصنیف فرمائے - بلا مبالغہ وہ اس میدان میں دورِ حاضر کے ابن تیمیہ ہیں -

اس وقت متعدد دینی و تبلیغی و اشاعتی اداروں کی طرف سے اظہار الحق پر کام ہو رہا ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں - ضرورت ہے کہ پاک و ہند میں علمائے کرام ازالۃ الاوہام فارسی ، ازالۃ الشکوک ، اور اعجازِ عیسوی اردو پر توجہ مبذول فرمائیں کہ جدید تقاضوں کے مطابق اسلام کے اس دفاعی سرمایہ کو عام کرنے کی اور ہر طبقہ میں پہنچانے کی بے حد ضرورت ہے - حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی تصانیف میں ازالۃ الاوہام فارسی ، ازالۃ الشکوک دو ضخیم جلدوں میں اور اعجاز عیسوی بہ زبان اردو قدیم ہندوستان کے اُس دور میں لکھی گئیں جب حضرت مولانا عیسائیت کے خلاف پادریوں کے مقابلہ میں صف آرا تھے - یہ سب کتابیں اور رسائل ہندوستان میں تالیف ہوئیں اور یہیں کے مختلف مطابع سے شائع ہوئیں -

اظہار الحق کی تکمیل قسطنطنیہ (ترکی) میں ہوئی - وہیں سلطان عبدالعزیز کے حکم سے عربی میں طبع ہو کر تمام بلادِ عربیہ میں تقسیم کی گئی اور سلطان ہی کے حکم سے متعدد زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے -

حضرت مولانا کی ان بے مثال خدمات اور عقیدت و محبت کا اعتراف کرتے ہوئے خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالعزیز نے حضرت مولانا کو عظیم الشان دینی خطاب اور رتبہ " پایۂ حرمین الشریفین " عطا فرمایا - یہ عظیم بابرکت خطاب صرف انھیں علمائے اجلاء اور مجاہدین عظام کے لئے تھا - جنکی خدمات اسلام اور مسلمانوں کیلئے بے حد عظیم اور وقیع ہوں - اسی کے ساتھ " تمغۂ مجیدی " درجہ دوم اور مرصع تلوار بھی عطا کی گئی اور مکہ معظمہ میں گورنر مکہ کی مجلس شوریٰ کے اعزازی رکن نامزد کئے گئے -

شاید اس حقیقت کا اعتراف و اظہار غلط نہ ہو گا کہ برصغیر یا سرزمین ہند کے علماء میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب ہی وہ واحد ہستی ہیں جنکو سلاطین وقت کی طرف سے یہ مراتب عالیہ مرحمت ہوئے - اس کے بعد دوبارہ مزید سلطان عبدالحمید کے دورِ خلافت میں قسطنطنیہ طلب فرمائے گئے - اکثر و بیشتر سلطان معظم عشاء کی نماز کے بعد مولانا کے ساتھ تخلیہ میں اہم معاملات پر گفتگو فرماتے - حضرت مولانا کی بینائی کافی کمزور ہو گئی تھی - قدیم آدابِ مجلس کے مطابق چونکہ جوتے دروازے پر چھوڑنے کا دستور تھا - اس لئے مجلس سے رخصت ہوتے ہوئے حضرت مولانا کو جوتے ٹٹولنے پڑتے تو اکثر سلطان معظم سبقت فرما کر اپنے ہاتھ سے مولانا کے جوتے سامنے لاکر پہنانے پر اصرار کرتے - ایکبار سلطان جوتا پہنانے کو جھکے تو حضرت مولانا نے آبدیدہ ہو کر سلطان کو اس سے باز رکھنا چاہا تو سلطان نے حضرت مولانا کے ہاتھ کو بوسہ دیکر فرمایا کہ " جب سے ہم نے علماء کے جوتے سیدھے کرنے چھوڑ دئے ہم پر جوتے پڑنے لگے "

یہ واقعہ اختصار کے ساتھ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مسلمانوں کا نظام تعلیم" میں حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے۔ ردِّ عیسائیت کے موضوع پر چونکہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت اقدس مولانا رحمت اللہ صاحب سے مکہ معظمہ میں طویل شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے اور ہندوستان آنے کے بعد بھی آپ نے استاد و مربی سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کا مفصل مکتوب گرامی حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے نام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رح نے خود مشاہدہ فرما کر اس کا اقتباس اپنی مذکورہ بالا کتاب میں شائع فرمایا۔

اب سے ایک سو سال قبل ارض پاک میں علوم دینیہ کی تدریس عام کتب حدیث و تفسیر و فقہ و نحو وغیرہ علوم نقلیہ تک محدود تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے جب کعبہ معظمہ کے سامنے صحن حرم میں مسندِ تدریس سنبھالی تو آپ نے اپنی فکر ثاقب اور بالغ نظری سے یہ مشاہدہ فرمایا کہ یہاں کی تدریس محض قال المصنف و قال الشارح کی حد تک عام سطحی طریقہ پر ہے۔ یہاں کے علماء علم الکلام، علم المناظرہ، منطق فلسفہ، ہیئت اقلیدس وغیرہ سے اگر قطعی نابلد نہیں تو کم از کم ان علوم کی معنویت سے دور ہیں اور حرمین میں یہ علوم انکی کتابیں بالکل غیر متعارف ہیں۔ چنانچہ آپ نے کمر ہمت باندھی اور بخاری شریف کے علاوہ مختلف اوقات میں درس نظامیہ کی خاص کتابیں اور علوم عقلیہ کی تدریس شروع فرمائی۔ ہندوستان سے کتابیں منگائیں۔ طلبہ کو ان علوم کا شوق دلایا تعارف کرایا۔ اور آج بھی مدرسہ صولتیہ کے کتب خانہ میں وہ کتابیں موجود ہیں۔ جن میں اب سے ایک صدی قبل کے علماء اور طلبہ نے حضرت مولانا سے انکا درس لیا اور حرم محترم کی علمی تاریخ میں چاند اور سورج بنکر چمکے۔ مکہ معظمہ کی علمی تاریخ میں وہ دن بھی تاریخی شمار ہوتا ہے۔ جب حضرت مولانا نے حجۃ اللہ البالغہ اور مقدمہ ابن خلدون کا درس شروع فرمایا۔ مدرسین اور طلباء کی جماعتیں پروانہ وار حلقہ درس میں شریک ہونے لگیں۔ حرمین شریفین کی علمی تاریخ لکھنے والے تمام اہل فکر و نظر اس پر متفق ہیں کہ جزیرۃ العرب میں علوم عقلیہ کا تعارف اور تدریس کا آغاز سب سے پہلے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمایا اور پھر مدرسہ صولتیہ کے ذریعہ یہ فیض جاری رہا۔

یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی تمام علمی، دینی تصانیف اور جہادی خدمات کے ساتھ آپکا سب سے بڑا کارنامہ ارض حرم پر "مدرسہ صولتیہ" ہے۔ یہ حقیقت بہت سے حضرات کے علم میں نہیں کہ مکہ معظمہ میں اب سے ایک سو بیس سال قبل کوئی علمی ادارہ یا مدرسہ نہیں تھا۔ سنہ ۱۲۸۵ھ میں ۲۷ رجب کی صبح کو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے کعبہ معظمہ کے سامنے "مدرسہ ہندیہ" کے نام سے ایک مدرسہ قائم فرمایا۔ یہ مدرسہ سنہ ۱۲۹۰ھ تک مسجد حرم اور محلہ شامیہ مکہ مکرمہ کے ایک مکان میں خدمتِ تعلیم انجام دیتا رہا۔ آخر قدرت کی طرف محسنۂ زماں صولت النساء بیگم کی قسمت میں یہ سعادت لکھی ہوئی تھی۔ آپ کلکتہ کی صاحبِ

خیر اور صاحب ثروت خاتون تھیں۔ ۱۲۸۹ھ میں اپنے داماد کے ہمراہ حج کو گئیں۔ حضرت مولانا کے نام نامی اور ہندوستان میں انکی شہرت اور کارناموں سے واقف تھیں۔ انھوں نے حضرت مولانا کے مدرسہ کو دیکھا۔ خیر پسند دل میں جذبہ پیدا ہوا اور مدرسہ کی تعمیر کے لئے گرانقدر رقم اس زمانہ کے تیس ہزار روپے پیش کئے۔ زمین خریدی گئی۔ عمارت کا آغاز ہوا اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے کمال مروت اور اعتراف احساس کے طور پر اپنے مدرسہ کا نام بدل کر اس محسنہ کے نام پر "صولتیہ" رکھا اور ماہ محرم ۱۲۹۱ھ سے اس میں باقاعدہ درس وتدریس کا فیض جاری ہوا۔ جو الحمد للہ آج تک نہ صرف جاری وساری ہے بلکہ مدرسہ صولتیہ ایک بین الاسلامی ادارہ اور مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مدرسہ صولتیہ کیا ہے؟ مدرسہ صولتیہ ایک مستقل تاریخ ہے۔ ایک مستقل تحریک ہے ایک منفرد مقصد کے لئے ارض حرم پر مسلمانوں کی منزل مقصود ہے۔ جو الحمد للہ اپنی راہ پر گامزن ہے۔ اس طرح اگر مولانا رحمت اللہ کے "مدرسہ ھندیہ" سے موجودہ "مدرسہ صولتیہ" کی عمر کا حساب لگایا جائے تو اس چشمۂ رحمت کا ایکسو سولہواں (۱۱۶) سال ہے۔

میرے واجب الاحترام بزرگ الحاج مولانا امداد صابری صاحب نے اپنے والدِ ماجد مبلغ اسلام حضرت مولانا شاہ شرف الحق صاحب صدیقی دہلوی کی حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سے نسبت تلمذ اور ایک سو سالہ دیرینہ قلبی وروحانی تعلق کی بناء پر یہ تقریب منعقد کی۔ جس میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور مدرسہ صولتیہ کے متعلق ان کی تصنیف "آثارِ رحمت" بھی آپ حضرات کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

میں عمومی اور خصوصی طور پر اپنی اور آپ سب حضرات کی جانب سے مولانا موصوف کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں یہ مختصر مضمون "ایک تعارف" ہے۔ جو حضرات اس تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ مولانا امداد صابری کی "آثارِ رحمت" اور ان کی دوسری بے مثل تصنیف "جہادِ آزادی کے روشن چراغ" مطالعہ فرمائیں۔
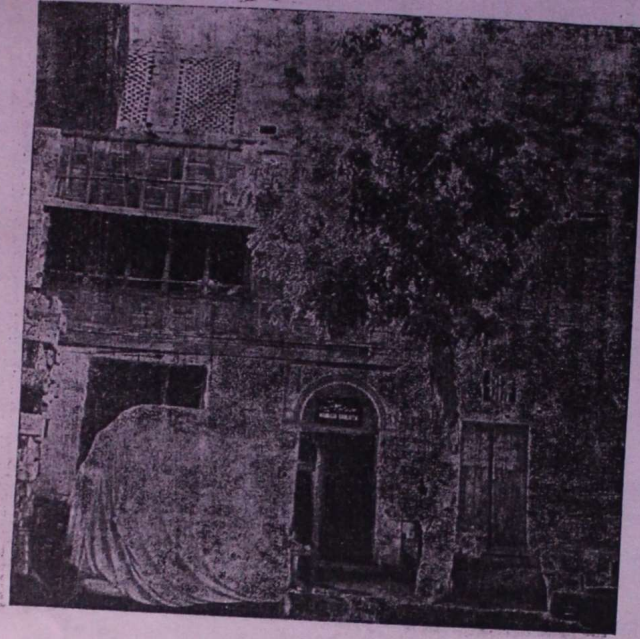
مدرسہ صولتیہ کی قدیم عمارت کا صدر دروازہ
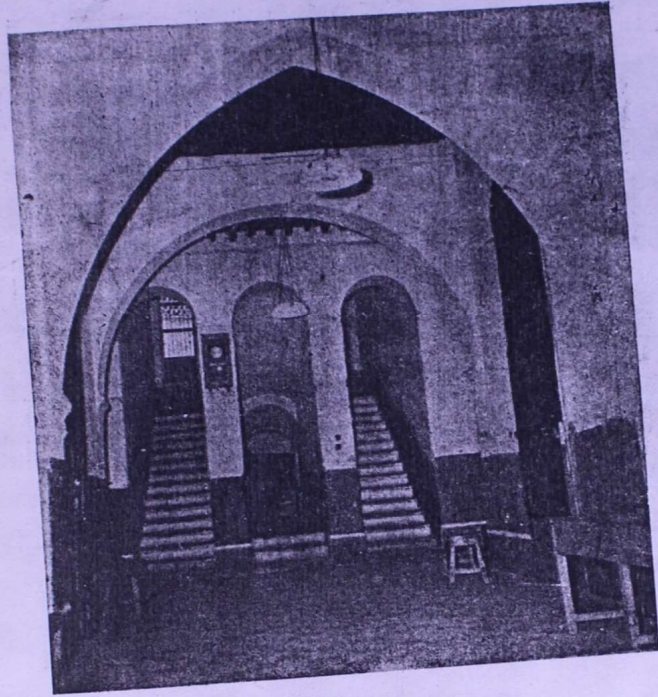
جدید مدرسہ صولتیہ کا اندرونی منظر
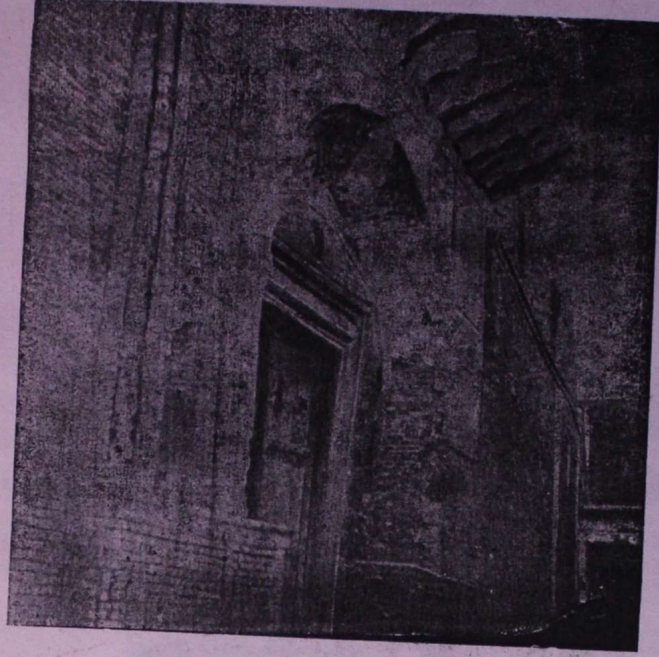
محلہ دربار کا وہ مکان جسمیں حضرتِ مولانا رحمتُ اللہ صاحب پیدا ہوئے
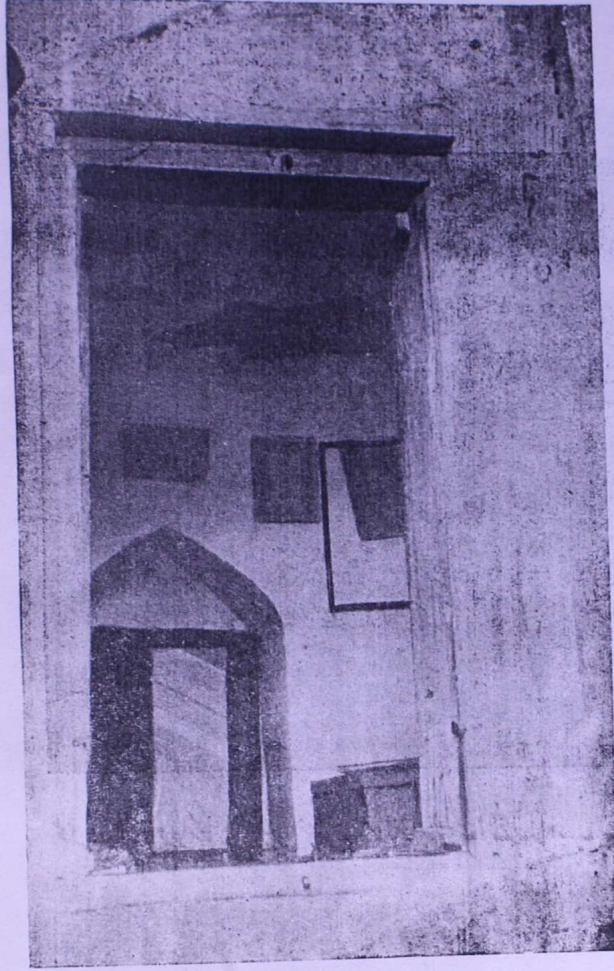
مسجد دربار کا وہ حجرہ جہاں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب روپوش رہے

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے خاندانی قبرستان میں جناب مولانا محمد سعید صاحب کا مزار

کیرانہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے خاندان کا ایک معمر فرد
جناب محمد فاروق صاحب اور ان کے قریب انکے صاحبزادے محمد رفیع
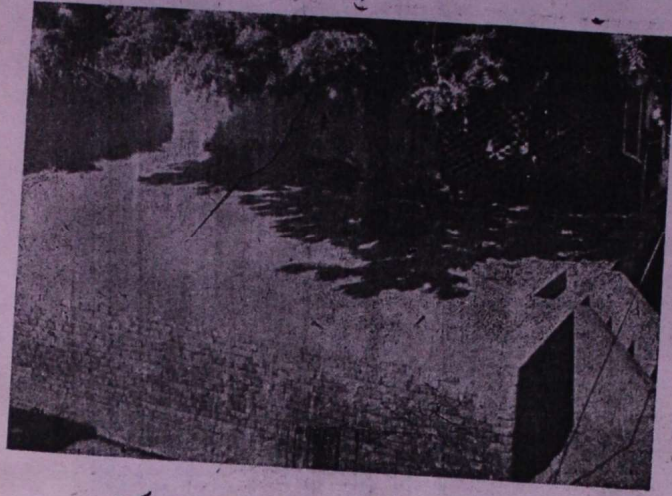
دربار دروازہ کے سامنے کا چبوترہ جسے دربار کے مجاہدوں کے خلاف
انگریزی فوجوں نے دمدمہ کے طور پہ استعمال کیا تھا۔
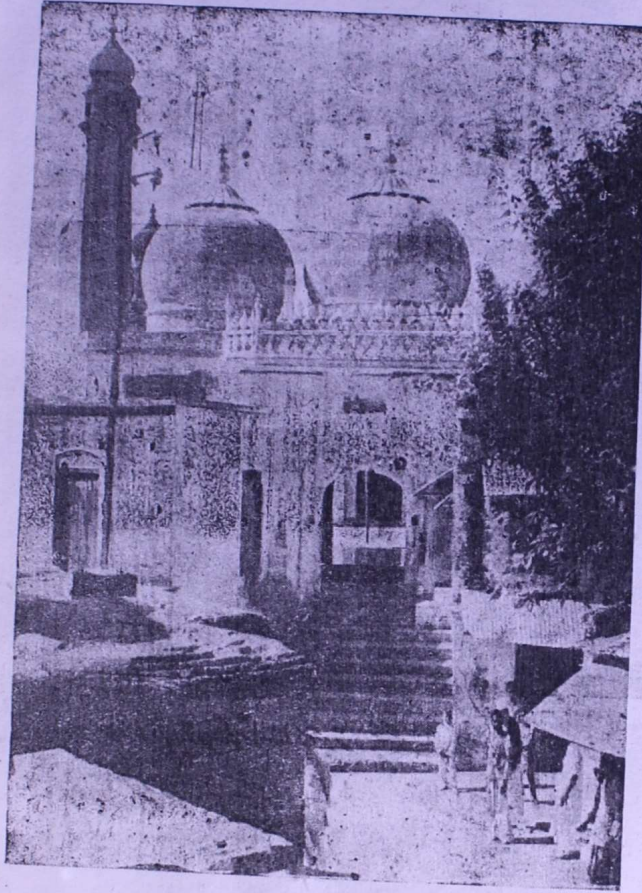
کیرانہ کی جامع مسجد کا دروازہ۔ جس کے سامنے کے میدان میں مجاہدین کا
اجتماع ہوتا ہے۔ اب یہاں بازار ہے۔
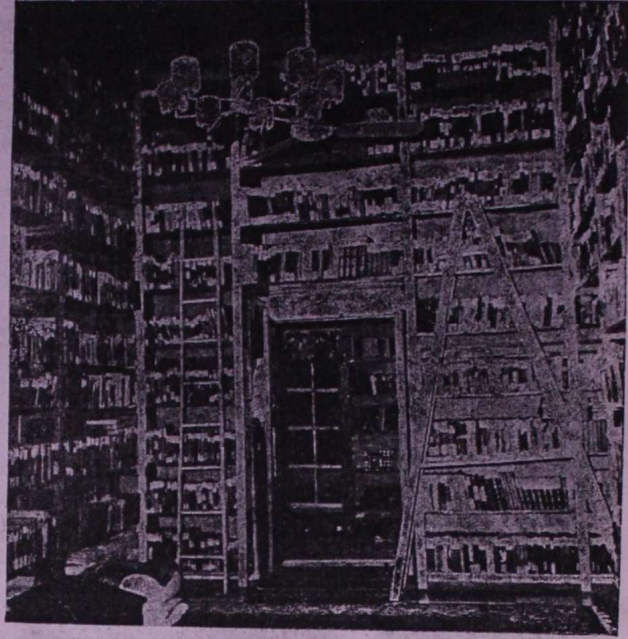
مدرسہ صولتیہ کے کتب خانہ کا بیرونی منظر

عکس تحریر حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب
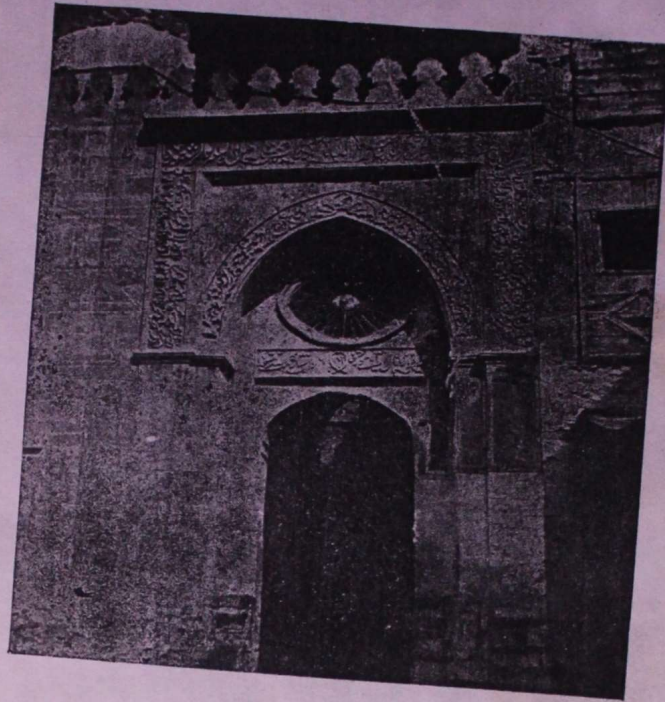
مدرسہ صولتیہ کی مسجد کا دروازہ

چودھری محمد عظیم کے خاندان کے ایک معمر شخص باجا کے ساتھ مولانا امداد صابری